Regd. L. No. 7243 Phone

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1980

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور ۹

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلیفون نمبر ـــــ ۸۸۰۸۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان = /۳۶ روپے غیر ممالک = /۳/۱/۲ پونڈ	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ ـ لاہور	۳ تین روپے

جلد ۳۳	مئی ۱۹۸۰ء	شمارہ ۵

فہرست

۱ ـ لمعات ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۲

۲ ـ حقائق و عبر ـ ـ ـ (۱) جزاك الله ! ـ ـ ـ ۷
(۲) گلہ کس پہ ؟ (۳) مصرعہ مکمل کیجئے !

۳ ـ اسلامی قانون کی تدوینِ جدید اور فقہی اختلافات ـ ـ ـ ۹
(محترم رفیع اللہ صاحب) (قسط اوّل)

۴ ـ فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ـ ـ ـ ۳۰

۵ ـ جہنمِ ارضی ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۳۱
پرویز صاحب کا ایک درسِ قرآن

۶ ـ مطالب الفرقان (جلد سوم) ـ ـ ـ ـ ـ ۴۱

۷ ـ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی (محترم پرویز صاحب) ـ ـ ـ ۴۲

۸ ـ قرآنی درس کے اعلانات وغیرہ ـ ـ ـ ـ ـ ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل ـ ناشر سراج الحق ـ مقام اشاعت ۲۵ بی گلبرگ ۲ ـ لاہور ـ پرنٹر شیخ نیاز احمد مطبوعہ ـ علمی پرنٹنگ پریس، ۱ ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سابقہ ماہ (مارچ ۱۹۸۰ء) میں، اسلام آباد میں، تعلیم سے متعلق دوسری عالمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں پاکستان کے (۳۲) ماہرینِ تعلیم کے علاوہ (۱۱) مسلم ممالک کے (۴۴) نامور مشاہیرِ تعلیم نے شرکت کی۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس کانفرنس کی نہ تو کوئی تفصیلی رپورٹ ہماری نظروں سے گزری ہے اور نہ ہی اس میں پیش کردہ مقالات، یا اس میں منظور کردہ قرار دادیں۔ کراچی سے شائع ہونے والے (انگریزی) جریدہ ڈان کی ۱۷ مارچ کی اشاعت کے اداریہ میں، صدر مملکت کے افتتاحی خطبہ کا ملخص اور اس پر اس اخبار کا تبصرہ شائع ہوا ہے۔ نیز اسلام آباد سے شائع ہونے والے (انگریزی) روزنامہ "دی مسلم" کی ۱۹ مارچ کی اشاعت میں مسٹر اے کے۔ بروہی کے مقالہ کے ایک دو اقتباس۔ یہی اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ (ڈان کی رپورٹ کے مطابق) صدر مملکت نے اپنے خطبہ میں پہلے اس حقیقت پر اظہارِ افسوس کیا کہ مسلم ممالک میں تعلیم ایک جسدِ بے روح سے زیادہ کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب تک یہ ممالک غیر اقوام کی غلامی میں تھے، اس تاسف انگیز حقیقت کی وجہ جواز قابلِ فہم تھی لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ انہوں نے حصولِ آزادی کے بعد بھی اس اہم ترین اور بنیادی مسئلہ کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ جو نظامِ تعلیم پہلے سے چلا آ رہا تھا اور جسے ان ممالک میں آزادی کے بعد بھی ملی حالہ قائم رکھا اس کی رُو سے :-

> ہمارے مذہبی مدارس کا مقصود و منتہیٰ اس قسم کے امام اور خطیب پیدا کرنا تھا جو لوگوں کی مذہبی ضروریات کو پورا کر سکیں۔ اور ہماری دنیاوی درس گاہوں کے پیشِ نظر مغربی انداز کے اربابِ نظم و نسق مہیا کرنا تھا۔ اس دوعملی کا نتیجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں تعلیم ایک بے روح پیکر بن کر رہ گئی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

> ماہرینِ تعلیم کے پیشِ نظر سب سے اہم اور مقدّم یہ مقصد ہونا چاہیئے کہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم کے اس تضاد اور ثنویت کو کس طرح ختم کیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ موجودہ نظامِ تعلیم کی اس طرح تشکیلِ نو کی جائے کہ "دنیاوی تعلیم"، مثل سائنس۔ ریاضی۔ تاریخ۔ جغرافیہ، جو اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے، اور قرآن۔ حدیث۔ فقہ وغیرہ کی خالص مذہبی تعلیم جو ہمارے مکاتب اور دارالعلوموں میں دی جاتی ہے، ان میں امتزاج پیدا کیا جائے ..... بالفاظ دیگر ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے

کہ جو طالبعلم مذہبی تعلیم حاصل کریں انہیں علومِ حاضرہ (سائنس وغیرہ) سے محروم نہ رکھا جائے، اور علومِ حاضرہ کے طالب علم، مذہب سے بیگانہ نہ رہیں۔ اور اس قسم کے نصابِ نو کو دنیا کے تمام مسلم ممالک میں رائج کیا جائے تاکہ ان ممالک کے مسلمانوں میں ہم آہنگیٔ فکر و نظر اور یک نگہیٔ مقاصد و اقدار پیدا ہو سکے۔

اخبار (دی مسلم) کی رپورٹ کی رُو سے، مسٹر بروہی کے مقالہ کا نقطۂ ماسکہ بھی یہی تھا کہ اس وقت مذہبی اور دنیاوی (SECULAR) تعلیم میں جو ثنویت پائی جاتی ہے اسے ختم کرنا چاہیئے اور اس خیال کو عام کرنا چاہیئے کہ علومِ حاضرہ کی تعلیم، غیر اسلامی نہیں۔ اس کا حصول نہایت ضروری ہے اور اسے نفسِ اسلام کا جزو بنایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا :-

> اگر ہم اس نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت بے نقاب ہو گی کہ جو کچھ آج کل یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے اس کا (۹۹) فیصد حصہ اسلامی تعلیم کا جزو بن سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عصرِ حاضر کے تمام علوم کا جائزۂ زندگی کے اس پس منظر میں لیا جائے قرآن جس کا تعین مومنین کے لئے کرتا ہے۔

ان ملخصات سے آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس کانفرنس میں مرکزی خیال اُس ثنویت کو دور کرنا تھا جو ہمارے ہاں مذہبی اور دنیاوی تعلیم میں پائی جاتی ہے۔ ہمیں اس سے خوشی ہوئی کہ ہمارے اربابِ دانش اور اعیانِ حل و عقد نے بالآخر اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ ہمارے نظامِ تعلیم کی بنیادی خرابی دینی اور دنیاوی تعلیم میں بُعد۔ تضاد اور ثنویت ہے اور جب تک ان میں امتزاج پیدا نہ کیا جائے، ہم اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

عام اہلِ پاکستان کے لئے (ممکن ہے) یہ خیال نیا ہو لیکن قارئین طلوعِ اسلام اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ طلوعِ اسلام، تشکیلِ پاکستان کے روزِ اوّل سے لے کر اس وقت تک اِسی ثنویت کا رونا روتے چلا آ رہا ہے اور اہلِ پاکستان کی بالعموم اور اربابِ بست و کشاد کی بالخصوص توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کراتے کہ تعلیم کے دائرے ہی میں نہیں بلکہ مسلمانوں کے فکر و خیال میں صدیوں سے "دین اور دنیا" میں جو ثنویت کارفرما چلی آ رہی ہے، جب تک اسے ختم نہیں کیا جائے گا، ہمیں نہ دنیا حاصل ہو سکے گی نہ دین۔ پاکستان میں طلوعِ اسلام کا اجراء ۱۹۴۸ء میں عمل میں آیا تھا۔ اس نے ایک ہی سال بعد (۱۹۴۹ء) میں، تعلیم کے مسئلہ پر بھرپور بحث کرتے ہوئے لکھا تھا :-

> حقیقت یہ ہے کہ محکومی اور آزادی میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ آزادی میں ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تربیت اپنے تصورات کے مطابق کر سکتے ہیں اور یہ چیز محکومی میں ممکن نہیں ہوتی۔ ہمیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ اِس دو سال کے عرصۂ آزادی میں ہم نے اپنے بچوں کی تعلیم میں کیا تبدیلیاں پیدا کی ہیں جس سے ان کا دل و دماغ ان سانچوں میں ڈھل جائے جو ہمارے تصورِ حیات کے آئینہ دار ہیں (واضح رہے کہ طلوعِ اسلام نے یہ لمعات ۱۹۴۹ء میں لکھے تھے اس لئے کہا گیا ہے کہ دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے اس دو سال کے عرصہ میں اس باب میں کیا کیا ہے) جہاں تک ہم دیکھ رہے ہیں اس سوال کا جواب نہایت مایوس کن ہے۔ ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ اس کوتاہی کے لئے کوئی بھی وجۂ جواز ہو سکتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو کارخانے کھولنے کے لئے مشینوں کی ضرورت ہے جو ممالکِ غیر سے منگانی پڑیں گی۔ اس لئے یہ احتیاج

ہماری صنعت وحرفت کی راہ میں حائل ہوسکتی ہے ہمیں اسلحہ و آلاتِ عسکریت کے لئے بھی بیرونی امداد کی احتیاج ہے اس لئے ہم اس باب میں بھی معذور ہیں۔ ہمیں فنی (TECHNICAL) شعبوں میں ٹریننگ کے لئے ماہرینِ فنون کی ضرورت ہے جن کی ہمارے ملک میں سردست کمی ہے۔ اس لئے ہم اس باب میں معذور ہیں۔ لیکن یہ فرمائیے کہ آپ کی راہ میں اپنے بچوں کے لئے جدید نصابِ تعلیم تیار اور نافذ کرنے کے لئے کون سا سنگِ گراں حائل ہے جس کے لئے آپ

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہیں"۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۲ء)

اس نے پھر اگست ۱۹۵۰ء میں اپنی اس پکار کو دہرایا۔ اور اس کے چار ہی ماہ بعد، دسمبر ۱۹۵۰ء میں، قوم کی توجہ پھر اس اہم مسئلہ کی طرف منعطف کرائی۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں حکومت کی طرف سے تعلیمی کمیشن کا تقرر عمل میں آیا اور اس نے ایک سوال نامہ جاری کیا اس سوال کے جواب میں کہ "ہماری تعلیم کس قسم کی ہونی چاہیئے"۔ طلوعِ اسلام نے جو کچھ لکھا تھا اسے غور سے ملاحظہ فرمائیے اس نے کہا تھا:۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ہماری تعلیم کا اوّلین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اُس زندگی کا تصور جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا ہے، صاف اور واضح طور پر ذہن نشین ہو جائے اور اس کی صداقت و محکمیت کا یقین دل میں راسخ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہج زندگی اور فلسفۂ حیات اس کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے جسے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے۔ اسی کو اسلام یا الدین کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس کے لئے واضح طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام (یا الدین) کیا ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اس کا مقصود و مطلوب کیا ہے؟ وہ کس قسم کے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ان انسانوں کا نصب العین کیا ہوگا؟ اور ان کی سیرت و کردار کس قسم کا ـــــ یہ انسان کس قسم کا معاشرہ قائم کریں گے؟ اُس معاشرہ کے نتائج خود اپنی مملکت کے لئے کیا ہوں گے اور باقی عالم انسانیت کے لئے کیا۔ (وغیرہ وغیرہ) اسی کا نام "اسلامی تعلیم" ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم نہ تو وہ ہوگی جو اس وقت ـــــ "اسلامیات" کے نام سے ہمارے اسکولوں میں اور کالجوں میں دی جاتی ہے اور نہ ہی وہ جس کا ماحصل ہمارے "علماء" ہوتے ہیں۔ اسکولوں میں جو کچھ دینیات کے نام سے پڑھایا جاتا ہے اس سے بچوں کے ذہن میں دین کے متعلق چند رسومات اور توہم پرستیوں کے سوا، اور کوئی تصورِ مرتسم نہیں ہوتا۔ باقی رہے ہمارے کالج (بلکہ یونیورسٹیاں) سو ان میں اسلامی تعلیم کا نہج و اسلوب وہی ہے جسے کبھی مغربی مستشرقین نے متعین کیا تھا۔ اس سے (غلط یا صحیح) کچھ معلومات تو ہم پہنچ جاتی ہیں، دین کی رُوح اور اس کی غرض و غایت کبھی سامنے نہیں آتی۔

اب رہے ہمارے مذہبی مدارس، سو ان میں جس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اُس کی غایت یہ ہے کہ طالب علموں کو فقہ کے کچھ مسائل بتا دیئے جائیں (وہ بھی بالخصوص ایسے جن کا تعلق شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) سے ہو) اور کچھ کتابیں وعظ و نصیحت کی پڑھا دی جائیں تاکہ وہ امامت کے فرائض ادا کر سکنے کے قابل ہو جائیں اور یہ ظاہر ہے کہ امامت کے فرائض سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ یا نماز جنازہ پڑھا دی جائے۔ جمعہ یا عیدین کا خطبہ دے دیا جائے یا نکاح پڑھا دیا جائے۔ جو علماء اس سے بلند درجہ پر ہوں وہ نکاح و طلاق وغیرہ کے

متعلق فتویٰ دے سکیں۔ یا (جو تقریر کرنا جانتے ہوں وہ) دوسرے فرقہ کے علماء سے مناظرہ کر سکیں۔ باقی رہا "نفسِ اسلام" تو وہ (مروجہ تعلیم کی رُو سے) ان حضرات کے سامنے آ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ حقیقی اسلام پر غیر اسلامی تصورات و نظریات، معتقدات و خیالات کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہیں کہ ان کی موجودگی میں حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ نہیں سکتی۔ اور ان پردوں کو الگ کر دینا ان حضرات کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے انہی پردوں کو اصلِ اسلام سمجھ رکھا ہے۔ یہ بعینہٖ وہ حالات تھے جن سے تنگ آ کر یورپ نے مذہب کو کلیسا کی چار دیواری تک محدود کر دیا اور دنیا کے معاملات اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق حل کرنے لگ گئے۔ جہاں تک مسئلہ زیرِ نظر (یعنی تعلیم) کا تعلق ہے یہی حالت ہمارے ہاں بھی ہے۔ یہاں "دینی تعلیم" مذہبی مکاتب میں دی جاتی ہے اور "دنیاوی تعلیم" اسکولوں اور کالجوں میں۔ اس باب میں ہم میں اور اہلِ مغرب میں فرق یہ ہے کہ اس عملی ثنویت (DUALISM) کے باوجود ہم ہر منبر اور اسٹیج سے پکارتے رہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست، روح اور مادہ، دین اور دُنیا میں کوئی مغائرت نہیں۔ اس قسم کی ثنویت یکسر غیر اسلامی ہے۔

لہٰذا، ہمارے ہاں تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم اٹھانے کا یہ ہے کہ "مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی اس ثنویت کو ختم کر دیا جائے"۔ جب ہمارے ہاں دین اور دنیا میں کوئی فرق نہیں تو مذہبی اور دنیاوی تعلیم الگ الگ درسگاہوں میں کیوں دی جائے؟ ہمارے ہاں عصرِ حاضر کے علوم کے ساتھ دین کی تعلیم ایک ہی درسگاہ میں دی جانی چاہیئے۔

سوالنامہ کے آخر میں، اسی حقیقت کو ان مختصر الفاظ میں دھرایا کہ

> اسلامیات کی تعلیم اس انداز کی ہونی چاہیئے کہ جس سے گورنمنٹ اسکولوں اور دینی دارالعلوموں کی ثنویت (DUALISM) ختم ہو جائے۔ ایک اسلامی حکومت میں اس امر کا تصور ہی تعجب انگیز ہے کہ دینی تعلیم کے لئے الگ مدارس ہوں اور دنیاوی تعلیم کیلئے جداگانہ اسکول۔ یہ تفریق غیر مسلم حکمرانوں کے دور کی یادگار ہے جو اب یہاں سے جا چکے ہیں۔
>
> ہمارے بچوں کی تعلیم خواہ وہ عمومی ہو یا فنی (TECHNICAL) اس میں قرآن کریم کے غیر متبدل قوانینِ حیات کی حیثیت بنیادی ہونی چاہیئے۔ وہ اصول جو تکریم و حریتِ آدمیت، فردِ کی ذات کی نشوونما ــــ عالمگیر انسانیت کی ربوبیت وغیرہ کا سبق دیتے ہیں۔

آپ ان اقتباسات پر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ جو کچھ طلوعِ اسلام نے بیس بائیس سال پہلے کہا تھا (اور وہ بھی حکومت کے مقرر کردہ تعلیمی کمیشن کے سوالنامہ کے جواب میں) کیا حالیہ عالمی کانفرنس کے اسٹیج سے (معناً ہی نہیں بلکہ حسنِ اتفاق سے لفظاً بھی) اسے ہی نہیں دھرایا گیا؟

طلوعِ اسلام نے حکومت کے مقرر کردہ کمیشن کے سامنے اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں پیش کر دیا لیکن (جیسا کہ حکومت کی طرف سے قائم کردہ کمیٹیوں اور کمیشنوں کے ساتھ اکثر ہوا کرتا ہے) نہ وہ کمیشن باقی رہا، نہ اس کی کوئی یادگار۔ تعلیم کا نظام اسی روشِ کہن پر قائم رہا۔ بایں ہمہ طلوعِ اسلام نے اپنی اس پکار کو جاری رکھا۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے طلوعِ اسلام کی جو مخالفت ہوتی رہی تو اس کی ایک وجہ اس کی طرف سے پیش کردہ جدید نظامِ تعلیم کی تجویز بھی تھی۔ ان کی طرف سے یہ مخالفت قابلِ فہم تھی۔ مذہبی مکاتب اور دنیاوی درسگاہوں کی ثنویت کو ختم کرنے کا فطری نتیجہ خود مذہبی پیشوائیت کے جداگانہ تشخص کا خاتمہ تھا۔

بہرحال، نہ حکومت کی طرف سے اس باب میں کوئی پیش رفت ہوئی، نہ قوم کی طرف سے اس قسم کا مطالبہ۔ اس صورتِ حال سے متاثر ہو کر، مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے ۱۹۶۵ء میں فیصلہ کیا کہ اگر قوم یا حکومت، بڑے پیمانے پہ اس کا انتظام نہیں کرتی، تو چھوٹے سے پیمانے پہ ہی سہی، انفرادی طور پر اس کی کوشش کر لی جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی مجوزہ درس گاہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ہمارے نظامِ تعلیم کا مقصود و منتہیٰ، پاکستان آئیڈیالوجی کو محسوس پیکر عطا کرنا ہے۔ اور

> پاکستان کی آئیڈیالوجی، قرآنِ کریم کی تعلیم اور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے قرآنی تصور کے سوا کیا ہے؟ لہٰذا، ہمارے نوجوانوں کی صحیح تعلیم کا مقصود بھی اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے قلب و دماغ کو اسی سانچے میں ڈھالا جائے اور ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ دُنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے، وہ فیصلہ کر سکیں کہ اس باب میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اس کا طریق یہ نہیں کہ دینی تعلیم کے لئے مکتب اور دارالعلوم الگ کھولے جائیں اور دنیاوی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج الگ، دین اور دُنیا کی یہ ثنویت یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ نہ ہی اس کا یہ طریق ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں ایک پیریڈ دینیات کا رکھ دیا جائے یا ایم۔ اے کے لئے اسلامیات کا الگ مضمون تجویز کر لیا جائے۔ ان طریقوں سے طالب علموں کی معلومات میں تو کچھ اضافہ ہو سکتا ہے لیکن ان سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جسے علامہ اقبالؒ نے نہایت جامع انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ ؎
>
> از کلیدِ دیں درِ دُنیا کشاد
>
> اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اسے حاصل کرنے کے بعد طالب علم اس قابل ہو جائے کہ "دُنیا کا ہر دروازہ دین کی چابی سے کھول سکے"۔ اس مقصد کے لئے تعلیم کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ طالب علم طبیعیات پڑھیں، یا عمرانیات، تاریخ پڑھیں یا فلسفہ۔ وہ معاشیات کا مطالعہ کریں یا سیاسیات کا ـــــ غرضیکہ وہ علم کے کسی شعبے سے متعلق کیوں نہ ہوں، انہیں یہ بتایا جائے کہ علم کا یہ شعبہ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے کس طرح ممد و معاون ہو سکتا ہے جسے قرآن نے انسانی زندگی کا مقصود و منتہا قرار دیا ہے۔ یہ پروگرام اس کے سوا کیا ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیٔ خداوندی کی روشنی میں نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کیلئے صرف کیا جائے۔ (طلوعِ اسلام جون ۱۹۶۵ء)

اس منصوبہ کے راستے میں کیا کیا موانعات پیش آئے اور کس کس قسم کی الجھنیں پیدا کی گئیں، ان کی بابت طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۷۹ء میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ اس قسم کی الجھنیں کسی نہ کسی شکل میں ساتھ ساتھ چلتی ہیں ـــــ غلط نظام نام ہی الجھنوں کے مجموعہ کا ہوتا ہے ـــــ لیکن قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (جس کے ذمے اس مجوزہ درسگاہ اور ریسرچ سنٹر کا قیام ہے) انہیں حل کرنے میں کوشاں رہتی ہے۔

ہم نے بات شروع کی تھی عالمی تعلیمی کانفرنس کی۔ تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ ہر قسم کے ناکام تجارب کے بعد، زمانے کے تقاضے، قوم کو اسی سمت آنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں جس کی نشاندہی طلوعِ اسلام نے تیس سال پہلے کی تھی۔ اگر قوم اس زمانے میں اس راستے کو اختیار کر لیتی تو سوچئے کہ آج اس قوم کا کیا رنگ اور اس مملکت کا کیا انداز ہوتا؟ (جیسے کہ ہم نے پہلے کہا ہے) جو کچھ اس کانفرنس میں کہا گیا ہے وہ ہمارے لئے وجہِ مسرت ہے۔ لیکن اس سے حقیقی خوشی تو اسی صورت میں حاصل ہو سکے گی جب یہ تصور عملی شکل اختیار کر لے۔ ایسا ہو سکے گا یا نہیں، اس کا جواب تو آنے والا وقت ہی دے سکے گا، اگرچہ سابقہ تجربہ اس کی زیادہ اُمید نہیں دلاتا۔ طلوعِ اسلام بہرحال، اپنی اس روش پر جسے وہ قرآن مجید کی روشنی میں صحیح سمجھتا ہے، اپنی رفتار اور بساط کے مطابق چلتا رہے گا۔ اور اسی حد تک ہم مکلف بھی ہیں۔ و افوض امری الی اللہ۔

حقائق و عبر

۱۔ جزاک اللہ

جولائی ۱۹۷۹ء کے طلوعِ اسلام میں "آرٹ اور اسلام" کے عنوان سے ایک بڑا بصیرت آفریں مقالہ شائع ہوا۔ یہ مقالہ جہاں خوش ذوق طبقہ میں نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، وہاں اس سے زاہدِ خشک قسم کے لوگوں کی پیشانیوں پہ بل پڑ گئے۔ اور یہ بالکل قابلِ فہم تھا۔ فیض کے الفاظ میں :-

جنابِ شیخ سے مے کا جواز کیا پوچھیں ۔ کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

مثلاً ماہنامہ محدث (لاہور) میں اس کے خلاف، ایک مقالہ مسلسل شائع ہو رہا ہے جس کی آخری قسط (ربیع الآخر ۱۴۰۰ھ) ہمارے پیشِ نظر ہے اس میں جس انداز سے طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کی گئی ہے اس سے ہماری طبیعت منغص ضرور ہوئی (یعنی طعن و تشنیع کے انداز کی وجہ سے) لیکن آگے چل کر ایک ایسی بات سامنے آئی جس سے ہماری زبان سے بیساختہ جزاک اللہ کے الفاظ نکلے اور ہمارے سارے گلے تمام ہو گئے، اس میں لکھا ہے :-

اقتباس ۴۔ زیرِ نظر میں دوسرے نمبر پہ دلیل لائی گئی ہے حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری شرح بخاری کی۔ کہ اس میں لکھا ہے۔ حضرت داؤد علیہ باجے کے ساتھ گایا کرتے تھے۔ جواباً عرض ہے کہ جس طرح محرف تورات سے طلوعِ اسلام کے مقالہ نگار کو دھوکا ہوا ہے، اسی طرح حافظ ابن حجر بھی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ فتح الباری کے قول کو نہ قرآن کریم کی سند حاصل ہے اور نہ وہ حجت ہو سکتا ہے (ص۴۶)

یہ تو تھا بخاری کے شارح کے متعلق۔ آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ خود بخاری (اور مسلم، بلکہ جملہ کتبِ روایات) کے متعلق کیا ارشاد فرمایا گیا ہے۔ تحریر ہے :-

پانچویں نمبر پہ اقتباس۔ زیرِ نظر میں موسیقی کے جواز پہ کتبِ روایات سے یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ مسجد نبویؐ میں حبشیوں کا ناچ ہو رہا تھا اور حضورؐ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جواباً عرض ہے کہ کتبِ روایات کو سند و حجت کا مقام حاصل نہیں۔ سند و حجت صرف قرآنِ حکیم ہے (ص۴۷)

اللہ اکبر! آپ نے غور فرمایا کہ کیا کہا جا رہا ہے؟ یہ کہ

کتبِ روایات کو سند و حجت کا مقام حاصل نہیں سند و حجت صرف قرآن حکیم ہے!

اور ایسا کون کہہ رہا ہے؟ خود اہلِ حدیث کا نقیب، محدث (لاہور) —— جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں!! ہم اس اعتراف و اظہارِ حقیقت پہ، موقر جریدہ محدث کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے گذارش کریں گے کہ انہوں نے جتنی گالیاں ہمیں اب تک دی ہیں، ان سے دگنی گالیاں دے کر، آخر میں اسی قسم کا اظہارِ حقیقت فرما دیا کریں تو (یقین مانیں) ان کی عاقبت سنور جائے گی۔

۲۔ گلہ کس پر؟

مؤقر جریدہ نوائے وقت نے اپنی اشاعت مورخہ ۴ر اپریل ۱۹۸۰ء کے اداریہ کا عنوان باندھا ہے :۔

. . . . . اور مفتی صاحب صرف سنتے رہے !

اس اداریہ میں کہا گیا ہے کہ جب مفتی محمود صاحب اگلے دنوں دیوبند کے جشنِ صد سالہ کی تقریب میں شرکت کے لئے بھارت تشریف لے گئے تو وہاں ان کی مسز اندرا گاندھی سے بھی ملاقات ہوئی جس کے دوران مسز گاندھی نے افغانستان میں روسی مداخلت کا بھی دبے لفظوں میں جواز پیش کیا۔ اس پر نوائے وقت نے لکھا ہے کہ مسز گاندھی نے جو کچھ کہا اس میں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

لیکن ہمارے لئے تعجب کی بات یہ ہے کہ مفتی صاحب کو اس ملاقات میں اعلائے کلمۃ الحق کا جو موقع ملا تھا اور جو علمائے کرام کی ایک منفرد روایت ہے، انہوں نے اس کا حق کیوں ادا نہ کیا؟ . . . . انہوں نے اس موقع سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا اس کے متعلق تو وہ خود ہی بہتر جانتے اور بیان کر سکتے ہیں لیکن اس طرح وہ اپنا فرض ادا کرنے اور اپنے قوم و ملک کے مؤقف کی ترجمانی اور خدمت ادا کرنے سے جس طرح قاصر رہے ہیں اس کا خود انہیں احساس ہو یا نہ ہو، پاکستان میں بیشمار لوگ اس پر مدت تک اظہارِ حیرت و افسوس کرتے رہیں گے۔

جہاں تک افغانستان کے مسئلہ کا تعلق ہے بھارت کے ایک لیڈر راجہ مہندر پرتاپ نے آج سے تیس سال پیشتر (یعنی ۱۹۵۰ء میں) اپنی سکیم کو ان الفاظ میں پیش کیا تھا :۔

جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابدی ہو گئی ہے۔ بنا بریں میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کر دے۔ (ویر بھارت۔ ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۰ء)

باقی رہے مفتی صاحب، سو ان کے متعلق جو کچھ نوائے وقت نے لکھ دیا ہے، اس پر ہم کسی اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

۳۔ مصرعہ مکمل کیجئے

: جماعت اسلامی کے ترجمان ہفتہ وار ایشیا کی ۱۳ر اپریل ۱۹۸۰ء کی اشاعت کے اداریہ میں، اس خبر پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے کہ سعودی حکومت میں نیا مسودہ دستور زیرِ غور ہے جس میں شورائیت کی سمت رخ کیا جائیگا۔ تبصرہ کے آخر میں کہا گیا ہے :۔

ایک اور بات کی جانب بھی ہم توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔ خبر ہے کہ شہزادہ نائف نے کہا ہے کہ سعودی عرب کا آئین صرف قرآنِ کریم ہوگا۔ بلاشبہ اس سے ان کا تصورِ قرآن، حدیث سے منقطع نہیں ہے لیکن زیادہ مناسب ہوگا کہ سعودی عرب کا جو بھی دستور بنے اس میں کتاب کے ساتھ سنت کا لفظ ضرور موجود ہو۔

پاکستان میں ایوب خان نے من مانی کرنیکے لئے سنت کے لفظ کو دستور سے خارج کرنیکی کوشش کی تھی لیکن عوامی احتجاج کے بعد اسے یہ لفظ بجنسہٖ دستور میں رکھنا پڑا۔ کتاب کے ساتھ سنت کے لفظ سے اسلام کا جامع تصور سامنے رہتا ہے اور بدعت، انحراف اور فرار کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد مودودی صاحب مرحوم نے تحریر فرمایا :۔

کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (ایشیا — ۲۳ر اگست ۱۹۷۰ء)

قسط اوّل

محترم رفیع اللہ صاحب

اسلامی قانون کی تدوینِ جدید اور فقہی اختلافات

ہمارے زمانے میں اسلامی قوانین کی تدوینِ جدید کا سوال سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اس کے راستے میں ناقابلِ عبور مشکلات حائل ہیں۔ پاکستان میں پہلے یہ اعلان ہوا کہ کتاب و سُنت کی روشنی میں ضابطۂ قوانین مرتب کیا جائے گا۔ بیس برس کی سعیٔ لاحاصل کے بعد یہ اعتراف کرنا پڑا کہ کتاب و سُنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطے مرتب ہی نہیں کیا جا سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ بہ سبیلِ تنزل یہ تجویز کیا گیا کہ یہ ضابطہ، فقہ حنفی پر مشتمل ہونا چاہیئے۔ غیر حنفی فرقوں کی طرف سے اس تجویز کی اصولی طور پر مخالفت ہوئی اور (سزاؤں سے متعلق جو) دو چار قوانین مملکت کی طرف سے نافذ ہوئے، تجربہ نے بتایا کہ وہ ناقابلِ عمل ہیں۔

بجائے اس کے کہ یہ سوچا جاتا کہ اس مسئلہ کا قابلِ عمل اور اطمینان بخش حل کیا ہے، اگلے دنوں ایک اسلامی کانفرنس میں یہ تجویز کیا گیا کہ اسلامی قوانین کا ایک ایسا ضابطہ مرتب کیا جائے جو تمام دُنیا کی مسلم مملکتوں میں نافذ کیا جا سکے تاکہ اس طرح وحدتِ امت کی طرف عملی قدم اٹھے۔ کسی نے یہ نہ سوچا کہ جب ایک ملک (پاکستان) میں اس قسم کا کوئی ضابطہ مرتب نہیں ہو سکا، تو تمام دُنیا کی مسلم مملکتوں کے لئے اس قسم کا ضابطہ کس طرح مرتب ہو سکے گا؟ مختلف مسلم ممالک میں، جہاں شرعی قوانین نافذ ہیں، بالعموم چار فقہیں رائج ہیں۔ حنفی۔ شافعی۔ مالکی۔ حنبلی۔ ذیل کے مقالہ میں (جو آج سے سولہ برس پہلے لکھا گیا تھا) یہ بتایا گیا ہے کہ معاشیات اور سیاسیات کے اہم اور بنیادی مسائل سے قطع نظر، چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل اور شخصی قوانین تک میں ان فقہوں میں کس قدر اختلافات ہیں۔ ان فرعی اختلافات سے اصولی مسائل میں اختلافات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان اختلافات کی روشنی میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جب کوئی فرقہ اپنی فقہ کے چھوڑنے کو تو ایک طرف، اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل تک کے لئے بھی تیار نہ ہو، دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب کرنا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟ اس (بظاہر) لاینحل مسئلہ کا حل کیا ہوگا اسے ہم مقالہ کے آخر میں بیان کریں گے۔ سرِدست آپ ان اختلافات پر ایک نظر ڈالئے۔ واضح رہے کہ جو مسائل

اس مقالہ میں مذکور ہیں' ان میں سے اکثر و بیشتر کے متعلق طلوعِ اسلام میں کسی نہ کسی جہت سے بحث ہو چکی ہے اس لئے ہم اس مقالہ میں اپنی کوئی رائے پیش نہیں کر رہے ۔ طلوعِ اسلام

آج کل ایک اہم موضوع پر جمہور کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ یہ موضوع ہے "علماء کا اختلاف" غنیمت ہے کہ ہمارے علماء نے کم از کم یہ تو محسوس کر لیا ہے کہ یہ اختلافات اُمت کے سوچنے والے طبقہ کو پریشان کر رہے ہیں ۔ چنانچہ مختلف پہلوؤں سے اس کی وضاحت کی جا رہی ہے اور یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کہ علماء کا یہ اختلاف اُمت کے لئے سراسر رحمت ہے ۔ مختلف لوگ اگر مختلف ائمہ فقہ کے اقوال کو اپنے لئے حجت سمجھتے ہیں تو یہ حق بات ہے ۔ کیونکہ ان تمام فقہا کا سرچشمہ کتاب و سُنّت تھا ۔ اور ان کے اختلاف اس ارشادِ نبویؐ کے عین مطابق ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ

روی الطبرانی مرفوعًا اَنّ شریعتی جاءت علی ثلثمائۃٍ و ستینَ طریقۃٍ ما سلک احدٌ طریقۃً منھا الا نجا ۔

طبرانی نے یہ فرمانِ نبویؐ نقل کیا ہے کہ شریعتِ اسلامیہ تین سو ساٹھ طریقوں کے مطابق آئی ہے ۔ ان میں سے کوئی سا طریقہ بھی اختیار کر لینا نجات کے لئے کافی ہے ۔

(کتاب المیزان للشعرانی مطبوعہ مصر جلد ۱ صفحہ ۲۸)

اس لئے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے قول پر عمل کر لیا جائے تو اس سے شریعت کا مقصد پورا ہو جائے گا ۔ کیونکہ ان حضرات نے ان مسائل کا استنباط قرآن و سُنّت سے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق کیا تھا جس میں اختلاف ناگزیر تھا ۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ باتیں محض نظری طور پر کی جاتی ہیں ۔ عملی طور پر اس اصول کی سخت مخالفت کی جا رہی ہے ۔ مثلاً ہمارے ملک میں (۱۹۶۲ء میں) جو عائلی قوانین نافذ ہوئے ان کی بیشتر دفعات کسی نہ کسی امام مجتہد کے قول پر مبنی ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود انہیں خلافِ اسلاف قرار دے کر ان کی سخت مخالفت کی گئی ۔ یہ ٹھیک ہے کہ کچھ حضرات کی مخالفت سیاسی قسم کی تھی ۔ لیکن بہت سے لوگ اس مخالفت میں اس لئے شریک ہو گئے کہ وہ ائمہ مجتہدین کے اقوال سے پوری طرح باخبر نہ تھے ۔

اسی طرح اور بھی بیسیوں ایسے اہم مسائل ہیں جن کے بارے میں اگر ائمہ مجتہدین کے ایسے اقوال لوگوں کے سامنے آ جائیں تو ان سے بہت سی باتیں صاف ہو سکتی ہیں ۔ اس مقصد کے لئے ہم مندرجہ ذیل تیس کے قریب اہم مسائل پر ائمہ مجتہدین کی آراء پیش کرتے ہیں ۔

۱ ۔ خلافت کے لئے قرشیت کی شرط
۲ ۔ حاکمِ عادل اور اجتہاد
۳ ۔ اجماعِ اُمت
۴ ۔ تقلید
۵ ۔ جمعہ کے لئے حکومت کی اجازت
۶ ۔ نکاح اور شہادتِ نکاح
۷ ۔ نکاح کی عُمر
۸ ۔ تعدّدِ ازواج
۹ ۔ مسئلہ کفو
۱۰ ۔ نکاحِ شغار

۱۱۔ اطلاق ثلاثہ	۱۲۔ حلالہ یا تحلیل
۱۳۔ طلاق اور خلع	۱۴۔ مفقود الزوج عورت کا مسئلہ
۱۵۔ عدت	۱۶۔ جمعہ اور عید کا ایک دن ہونا
۱۷۔ صدقۃ الفطر	۱۸۔ عبادات پر اُجرت لینا
۱۹۔ مسئلہ قربانی	۲۰۔ رہن
۲۱۔ پردہ	۲۲۔ ڈاڑھی کا مسئلہ
۲۳۔ مضاربت	۲۴۔ سود
۲۵۔ شراب نوشی کی حد	۲۶۔ چوری کی سزا
۲۷۔ حدِ زنا	۲۸۔ بادشاہ کے خدائی حقوق
۲۹۔ محرابِ مسجد	۳۰۔ تصویر کا شرعی حکم

۱۔ خلافت کے لئے قرشیت کی شرط

اس مضمون کی کئی احادیث پیش کی جاتی ہیں کہ اسلام میں خلافت صرف قریش کا حق ہے۔ اور کوئی دوسرا شخص مسلمانوں کا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ یہ اصول اسلامی مساوات کے خلاف تھا اس لئے علماء مختلف زمانوں میں اس کی مختلف تاویلات کرتے رہے ہیں۔ معتزلہ اور خوارج کے نزدیک تو یہ نظریہ ہی سرے سے باطل ہے اور بعض کا نظریہ اس سے بھی زیادہ "ترقی پسندانہ" ہے۔ چنانچہ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:-

بعض لوگوں کا خیال بالکل ہی جدا ہے کہ امام کا تقرر نہ عقل کی رُو سے واجب ہے نہ شرع کی رُو سے۔ معتزلہ میں سے اصم اسی خیال کا پیرو ہے اور بعض خوارج وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

(مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ نور محمد کراچی صفحہ ۲۲)

جو حضرات خلافت کے لئے قرشیت کی شرط تسلیم نہیں کرتے وہ حضرت عمرؓ کا یہ قول پیش کرتے ہیں:-

"تأسف (عمرؓ) علی سالم مولی ابی حذیفۃ وقال لو کان حیاً لم یختلجنی فیہ شك۔

حضرت عمرؓ نے سالم مولی ابی حذیفہؓ کے بقیدِ حیات نہ ہونے پر اظہارِ افسوس کیا اور کہا کہ کاش اگر وہ زندہ ہوتے تو مجھے ان کے خلیفہ مقرر کرنے میں کسی قسم کا کوئی شک نہ ہوتا۔

(المنہاج السنہ لابن تیمیہ۔ جلد ۳ ص ۱۵۸)

حضرت سالمؓ، قریشی تو درکنار نسلاً عربی بھی نہیں تھے۔ بلکہ بالاتفاق عجمی تھے اور وہ بھی کوئی آزاد عجمی نہیں بلکہ ابو حذیفہؓ یا ان کی بیوی کے آزاد کردہ غلام۔　(میثاق لاہور۔ بابت دسمبر ۵۹ صفحہ ۳۲)

کم و بیش تمام علماء نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ چونکہ واقعہ صحیح تھا اس لئے اس سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اکثر حضرات نے اسے صرف نقل کر کے چھوڑ دیا اور اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ علامہ ابنِ خلدون نے اس

کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

کبھی یہ لوگ[1] حضرت عمرؓ کے اس قول سے دلیل لاتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ

اگر سالم مولی حذیفہ زندہ ہوتے تو میں ان کو خلیفہ مقرر کر دیتا۔ حالانکہ یہ کلام ان کے مفید مطلب نہیں کیونکہ صحابی کا مذہب ہمارے لئے حجت نہیں۔" (مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۲۲۳۔۲۲۲)

لیکن اس کے باوجود خود علامہ صاحب بھی اس اصول سے مطمئن نظر نہیں آتے (کہ خلافت کے لئے قرشیت کی شرط ہے)۔ اور جس حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے اس کی یہ تاویل پیش کرتے ہیں :۔

لہٰذا، قرشیت کی شرط میں کوئی اور مصلحت بھی ہونی چاہیئے جو اصل غرض کا کام دے جب بات کو اور گہرائی سے دیکھا جائے تو قومی عصبیت پر آکر نظر جمتی ہے کہ یہاں اس کا اعتبار کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے حمایت و مطالبہ ممکن ہے۔ اور اسی کی بدولت امام کے بارے میں نزاع و اختلاف اٹھ جاتا ہے۔ اور ساری امت اس کو بطمانیت قلب تسلیم کر لیتی ہے۔" (ایضاً ص۲۲۳)

اور پھر اس تاویل کے ذریعہ قرشیت والی شرط اڑا دیتے ہیں :۔

مگر اب قریشی عصبیت مفقود و معدوم ہو چکی ہے۔ اب اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ ہر ملک میں اس شخص کو امیر و امام بنایا جائے جس کی عصبیت ملک میں غالب و باشوکت ہو۔ (ایضاً ص۲۲۴)

اس شرط کے مخالف یہ حدیث بھی پیش کرتے ہیں :۔

وعن ام الحصین الاحمیسة انها سمعت النبی صلعم یقول اِسْمَعُوا واطیعوا وَاِنْ اُمِّرَ علیکم عبدٌ حبشیٌ ما اقام فیکم کتاب اللہ عزوجل رواہ الجماعة الا البخاری۔

(نیل الاوطار جلد ۸ صفحہ ۲۰۴)

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اگر ایک حبشی کو بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے تو اس کی اطاعت کرو جب تک کہ وہ تم میں اللہ تعالےٰ کی کتاب کو قائم کرے۔

اس کی یہ تاویل کی جاتی ہے کہ اس سے مراد ماتحت امیر ہیں نہ کہ خلیفہ۔ خلافت کے متعلق اولین بحث جو سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوئی اس کی پوری پوری تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس میں نہ حضرت ابوبکرؓ سے اور نہ ہی حضرت عمرؓ سے خلافت کے لئے قرشیت کی شرط والی حدیث بطور سند پیش کی گئی۔ بلکہ سارے قصہ میں کہیں اس کا ذکر تک نہیں حالانکہ اس کا صحیح مقام وہی تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں گیارہ ہجری کے واقعات میں حضرت عمرؓ کے صرف مندرجہ ذیل الفاظ ملتے ہیں :۔

واللہ لَا تَرْضَیٰ العرب اَنْ یؤمّروکم و نبیها مِنْ غیرکم ولکن العرب لا تمتنع اَنْ تولی امرها مَنْ کانت النبوة فیهم و ولی امورهم منهم۔

(تاریخ ابن خلدون جلد ۳ صفحہ ۲۰۹ السنة الحادیة عشرة)

اے گروہ انصار! اللہ کی قسم اہل عرب آپ کو امیر بنانے پر راضی نہ ہوں گے جب کہ ان کا نبی دوسرے قبیلہ سے ہو۔

---

[1] یعنی وہ علماء جو خلافت کے لئے قرشیت کی شرط تسلیم نہیں کرتے۔ ۱۲

ہاں جس گھرانے میں نبوت ہے ان سے خلیفہ مقرر کرنے پر ان کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

چنانچہ بڑی لمبی چوڑی بحث کے بعد مصالحت کے لئے مختلف صورتیں پیش ہوئیں۔ حضرت خبابؓ نے فرمایا: وان ابیٰ القومُ فمنّا الامیرُ و منھم امیر کہ اگر قوم انکار کرے تو ایک امیر ہم سے ہو اور ایک قریش سے۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے یہ فرما کر اسے رد کر دیا۔

فقام عمر رضی اللّٰہ فقال ھیھات لا یجتمعُ سیفانِ فی غمدٍ واحدٍ۔

آپ نے فرمایا کہ ایک میان میں دو تلواریں کبھی اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ (الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ صفحہ)

آخری فیصلہ اس بات پر ہوا۔

فنحنُ الامراءُ وانتم الوزراء لا نفتاتُ دونکم بمشورۃٍ ولا تنقضی دونکم الاموایضاً

کہ امیر تو ہم سے یعنی قریش سے ہوں گے اور وزیر انصار سے۔ ہم تمہارے مشورہ کے بغیر نہ ہی کوئی فیصلہ کریں گے اور نہ ہی تمہاری اجازت کے بغیر کوئی اہم کام طے ہوگا۔

تاہم روایات کے مطابق حضرت سعد بن عبادہؓ نے (جو انصار کی طرف سے اُمیدوار تھے) اس فیصلہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اعلانِ مخالفت کیا۔ وہ حضرت عمرؓ فاروق کے زمانے میں شام چلے گئے جہاں انہوں نے وفات پائی۔

یہ بات حیطہ خیال میں بھی نہیں آسکتی کہ انصار جنہوں نے حضور صلعم کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا حدیثِ رسولؐ کے خلاف ایسا طرزِ عمل اختیار کرتے۔ ضمناً، حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا قول (لا یجتمعان سیفان فی غمدٍ واحدٍ) سے فقہاء نے یہ مسئلہ مستنبط فرمایا ہے کہ ایک ملک میں ایک وقت میں ایک ہی امیر ہو سکتا ہے۔ (خواہ امت میں سینکڑوں امیر ہوں۔ یا للعجب!)

۲۔ حاکم اور اجتہاد

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی ملک میں کس کے اجتہاد پر عمل کیا جائے گا۔ اور اجتہاد کا حق کس کو ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے:۔

اسلام کے ابتدائی دور میں ایک ہی شخص والی اور قاضی کے فرائض سر انجام دیتا تھا۔ فاروقِ اعظمؓ نے علیحدہ قاضی بھی مقرر کئے تاہم ان قاضیوں کا کام مختصر نوعیت کا تھا۔ یہ قاضی صرف شہری جھگڑوں کو نپٹاتے تھے۔ قصاص اور حدود کے مقدمات کا فیصلہ امیر المومنین خود کرتے تھے۔ (ایضاً اختصاص القاضی فی ہذا العصر)

لیکن جب کسی قاضی کو قرآن مجید اور رسول اللہ صلعم اور خلفاء کے فیصلوں کی نظیریں نہ ملتی تھیں تو وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے بلکہ اس کے لئے وہ خلیفۂ وقت کے اجتہاد کے مطابق تصفیہ کرتے تھے۔ تاریخ القضائی الاسلام میں لکھا ہے:۔

قاضی اہم مسائل، خلیفہ کا حکم معلوم کرنے کے لئے ان کی طرف ارسال کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے قاضی عیاض بن عبد اللہ نے حق شفعہ کے متعلق خلیفہ کا حکم دریافت کیا اس سے پہلے قریبی پڑوسی پھر اس کے قریب کے پڑوسی کے حق میں فیصلہ دیا جاتا تھا تو آپ نے جواباً لکھا کہ اب یہ حق صرف شریک ہی کو دیا جائے اور ساتھ ہی لکھا کہ جب میراث میں مختلف شرکاء کے واضح حصے مقرر کر دیئے گئے اور لوگوں کے اپنے گھروں اور زمینوں میں جانے

کیلئے علیحدہ علیحدہ راستے ہوں تو پھر حقِ شفعہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے مسئلہ میں ایک ایسی عورت کی دیت کے متعلق وضاحت چاہی جو کسی راہ رو کے گھوڑے کی وجہ سے جاں بحق ہو گئی ہو اور اس شخص کے رشتہ دار دیت دینے سے انکاری ہوں تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ حکم لکھ کر بھیجا کہ دیت اس کے رشتہ داروں پر ہو گی۔ اس کے علاوہ بھی قاضی نے بہت سے مسائل دریافت کئے۔ (ایضاً باب مرجع القاضی فی احکامہ)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت میں مشتبہ معاملات میں معروف و منکر کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف خلیفۂ وقت کو ہو گا۔ احادیث بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہیں۔

عن عمرو بن العاص اَنَّہٗ سَمِعَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اِذَا حکم الحاکمُ فاجتھد فاصاب فَلَہٗ اجرانِ وَاِذا حکم فاجتھد فَخَطَا فَلَہٗ اجرٌ قال یزید فحدثتُ بھذا الحدیث ابابکر بن حزمٍ فقال ھکذا حدثنی ابوسلمۃ بن عبدالرحمان عن ابوھریرۃ۔

قال الشافعی و معنی الاجتھاد مِنَ الحاکم اِنّما یکونُ بعد ان لا یکونُ فیما یریدُ القضاء فیہ کتابٌ ولا سنۃٌ ولا امرٌ مجتمع علیہ۔

حضرت عمر بن عاص سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی صلعم کو یہ فرماتے سنا کہ حاکم جب اجتہاد کرے اور ٹھیک فیصلہ پر پہنچ جائے تو اس کو دوگنا ثواب ملے گا لیکن اگر اس کے اجتہاد کرنے میں غلطی ہوئی تو ایک حصہ ثواب کا پھر بھی حقدار ہو گا۔ یزید کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث ابوبکر بن حزم کو سنائی تو انہوں نے بتایا کہ انہیں بھی یہ حدیث ابوہریرہؓ سے ابوسلمہ کے واسطے سے پہنچی ہے۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حاکم جس مسئلہ کا فیصلہ چاہتا ہے وہ اجتہاد صرف اسی صورت میں کرے گا جب کہ وہ مسئلہ کتاب و سنت میں نہ ہو گا۔ اور نہ ہی اس پر اجماع ہو۔

(کتاب الام۔ جلد ششم صـ۲۰۳)

ان تمام واقعات اور احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی ایسا مسئلہ پیدا ہو جائے جس کے متعلق قرآن، حدیث اور اجماع سے کچھ نہ ملے تو اس کے معروف منکر ہونے کا فیصلہ صرف خلیفۂ وقت کرے گا۔ اس مقصد کے لئے وہ اہلِ علم کے مشورہ سے مستفید ہو سکتا ہے۔

۳۔ اجماعِ اُمّت

آج کل قرآن و سنت کی طرح اجماع امت کا لفظ بھی بار بار زبانوں پر سنائی دیتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی واضح تعریف کسی کے ذہن میں بھی نہیں۔ ائمہ کے درمیان بھی اس بارے میں سخت اختلاف ہے۔

امام مالکؒ کے نزدیک اجماعِ اُمت کے لئے لازمی شرط یہ ہے کہ کسی مسئلہ پر صرف مدینہ شریف کے اہلِ علم متفق ہوں۔

وقال مالک لیشترط فیہ کونھم مِنْ اھل المدینۃ (نورالانوار صفحہ ۲۲۰)

لہ آج کی اصطلاح میں مرکزی حکومت کو۔ (طلوعِ اسلام)۔

بعض ائمہ کے نزدیک اجماع سے مراد کسی مسئلہ پر صرف صحابہ کا اجماع ہے۔

قال بعضھم لا اجماع الا للصحابۃ۔ (ایضاً)

اور بعض اس کا حقدار صرف اہلِ بیت کو ہی سمجھتے ہیں۔

وقال لا اجماع الا لعترتہ (ایضاً)

احناف کے نزدیک اجماع کی تعریف یہ ہے۔

وھو فی اللغۃ الاتفاق وفی شریعۃ اتفاق مجتھدین الصالحین من امۃ محمد فی عصر واحد علی امر قولی اوفعلی (ایضاً صفحہ ۲۱۹)

اجماع کے لغوی معنی اتفاق ہیں اور شرعی اصطلاح ہیں اس سے کسی زمانے میں امت مسلمہ کے نیک ائمہ کا کسی قولی یا فعلی مسئلہ پر اتفاق مراد ہے۔

اسی مضمون میں مختلف مسائل کے تفصیلی احکام ملاحظہ کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ ایسے مسائل کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ تاہم مجتہدین کی شرط بھی انہی تک محدود ہے جو عوام کی سمجھ سے بالاتر ہوں۔ جو مسائل عام لوگ بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہوں ان کے متعلق حکم یہ ہے:-

الا فیما یستغنی عن الرائی فانہ لا یشرط فیہ اھل الاجتھاد بل لا بد فیہ من الاتفاق الکل من الخواص والعوام حتی لو خالف واحد منھم لم یکن اجماعاً کنقل القراٰن واعداد الرکعات ومقادیر الزکوٰۃ۔ (ایضاً ۲۲)۔

جن مسائل میں فکر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ان کے لئے مجتہدین کی بھی کوئی شرط نہیں بلکہ اس کے لئے تو ہر خاص وعام کا متفق ہونا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک عام فرد نے بھی کسی ایسے عام مسئلہ کی مخالفت کی تو یہ اجماع نہ ہوگا۔ مثلاً نقل قرآن، نماز کی رکعات کی تعداد اور زکوٰۃ کی مقدار وغیرہ۔

۴۔ تقلید تقلید سے مراد شرعی مسائل میں کسی فقہی مذہب کی پیروی کرنا ہے۔ دورِ اوّل میں مسلمان دو تین صدیوں تک اس لفظ سے آشنا تک نہ تھے۔ جب بعد میں فقہ کی تدوین ہوئی تو اس وقت کے سیاسی حالات کے مطابق لوگوں نے سہولت کی خاطر اپنی اپنی پسند کے ائمہ کی تقلید شروع کر دی۔ اس سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا اور رفتہ رفتہ تقلید جامد کا زور بڑھتا گیا۔ یہی صورتِ حال اس وقت تک جاری ہے۔

۵۔ جمعہ کے لئے حکومت کی اجازت

ائمہ اربعہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جمعہ کی نماز حکومت کی اجازت کے بغیر درست نہیں، تاہم اس کی تفصیلات میں کچھ اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تو سلطان کی اجازت کے بغیر جمعہ ہوتا ہی نہیں۔

والمستحب ان لا تقام الجمعۃ الا باذن السلطان فان اقیمت الجمعۃ بغیر اذنہ صحت عند مالکؒ والشافعیؒ واحمد وقال ابوحنیفہؒ لا تنعقد الا باذن السلطان۔

مستحب ہے کہ جمعہ سلطان کی اجازت کے بغیر نہ ہو اور اگر اجازت نہ لی گئی ہو تو امام مالکؒ۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک تو ہو جائے گا لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک سلطان کی اجازت کے بغیر جمعہ صحیح نہ ہوگا۔

(رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ جلد اوّل صفحہ ۱۸)

معلوم رہے کہ یہاں سلطان سے مراد وہی عباسی خلفاء اور ان کے ماتحت حکام ہیں جن کے دور میں فقہ کی تدوین ہوئی تھی۔

۶۔ نکاح اور شہادتِ نکاح

ائمہ نے مختلف حالات میں نکاح کے بھی مختلف احکام دیئے ہیں۔ جب کسی شخص کو زنا کا مرتکب ہونے کا خدشہ ہو تو ایسے شخص کے لئے شادی فرض ہوگی۔ اگر زنا کا خدشہ موجود نہیں لیکن کسبِ حلال سے زوجہ کا نان نفقہ پورا کر سکتا ہے تو ایسے شخص کے لئے نکاح سنت ہے۔

اگر شادی کے سبب سے کوئی شخص کسبِ حرام پر مجبور ہو جائے یا کسی کی حق تلفی کا موجب بنتا ہو تو ایسی صورت میں شادی حرام ہوگی اور اگر حرام کی کمائی میں پڑنے کا صرف احتمال ہو تو اس وقت مکروہ تحریمہ ہوگی۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۴ صفحہ ۶، ۷)

جس لڑکی سے شادی کا ارادہ ہو، مناسب یہ ہے کہ شادی سے پہلے اسے دیکھ لے تاکہ بعد میں بدمزگی کا سبب نہ ہو۔ لڑکی مرد سے کم عمر ہونی چاہیئے۔ لیکن چھوٹی لڑکی کو بوڑھے مرد سے بیاہ دینا جائز نہیں۔ (ایضاً ۸)

نکاح کی مشہوری کے لئے دف بجانا۔ جھنڈیاں لگانا یا چراغ جلانا وغیرہ مستحب ہیں۔ دف کے آگے قوسین میں (طبل) کا لفظ ہے جس کے معنی ڈھول ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۸)

۷۔ نکاح کی عمر

جمہور علماء کے نزدیک شادی کے وقت لڑکی یا لڑکے کا بالغ ہونا شرط نہیں ہے۔ تاہم بعض ائمہ ایسے بھی گزرے ہیں جن کے نزدیک بلوغیت شادی کی شرط ہے۔ شمس الائمہ امام سرخسیؒ فرماتے ہیں:۔

بخلاف مایقول ابن شبرمۃ و ابوبکر الاصم انہ لا یزوج الصغیر والصغیرۃ حتی یبلغا لقولہٖ تعالیٰ حتی اذا بلغوا النکاح فلو جاز التزویج قبل البلوغ لم یکن لھذا فائدۃ۔

(المبسوط جلد ۴ صفحہ ۱۹۳)

امام ابن شبرمۃ اور قاضی ابوبکر الاصم کے نزدیک نابالغ لڑکے اور نابالغ لڑکی کی شادی جائز نہیں جب تک کہ وہ بلوغت کو نہ پہنچ جائیں۔ جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے "کہ جب وہ نکاح کی عمر یعنی بلوغت کو پہنچ جائیں"۔ اگر بلوغت سے پہلے نکاح ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

صغر سنی کی شادیوں سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں ان کو ختم کرنے کے لئے حکومتِ مصر نے ۲ جمادی الاوّل سنہ ۱۳۴۲ھ کو قانون نمبر ۶۰ مرتب کیا جس میں امام ابن شبرمۃ کے مذہب کے مطابق شادی کے لئے لڑکے کی کم از کم عمر ۱۸ سال اور لڑکی کی ۱۶ سال قرار دی گئی۔ اگرچہ اس کے مرتب کرنے والے علماء تھے لیکن حکومتِ مصر نے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے اس قانون کو اسی سال ۱۹ جمادی الاوّل کو گورنمنٹ گزٹ نمبر ۱۲۳ میں شائع کیا اور اعتراضات کے لئے

ایک ماہ کی مہلت دی۔ جب کوئی اعتراض نہ آیا تو مقررہ وقت گزرنے کے بعد یہ مصر کا سرکاری قانون بن گیا۔
(تاریخ القضاء فی الاسلام صفحہ ۶۷)

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بلوغت کی حد اس سے بھی زیادہ ہے۔ ان کے نزدیک لڑکے کی بلوغت کی عمر ۱۹ سال اور لڑکی کی ۱۷ سال ہیں۔ اما غھما بالسن فقد راٰی ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فی الجاریۃ بِسَبْعَ عشرۃ سَنَۃً وفی الغلام بتسعَ عشرۃ سنۃً۔ (المبسوط جلد ۶ صفحہ ۵۳)

عینی میں علامہ ابن حزم کا ایک قول منقول ہے کہ لا یجوز للاب ولا لغیرہ النکاح الصغیر الذکر حتی یبلغ فان فعل فھو منسوخ ابداً۔ کہ نہ باپ اور نہ کوئی اور، بلوغت سے پہلے کسی لڑکے کا نکاح کر سکتے ہیں اور اگر انہوں نے ایسا کر بھی دیا تو وہ نکاح ہمیشہ کے لئے فسخ ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں بلوغت سے پہلے نکاح جائز ہی نہیں کیونکہ یہ ایک قسم کا معاہدہ ہے جیسا کہ قرآن مجید نے اس کی وضاحت کی ہے، فَاَخَذْنَ مِنْکُمْ مِّیْثَاقًا غَلِیْظًا۔ (۴/۲۱)۔ بیضاوی میں ہے کہ میثاق سے مراد کلمۃ اللہ ہے اور کلمۃ اللہ سے مراد نکاح ہے۔
(بدائع الصنائع للکاسانی جلد ۴ صفحہ ۲۲۹)

۸۔ تعدد ازواج

اس مسئلہ پر بھی ائمہ مجتہدین میں بڑا اختلاف ہے۔ کچھ علماء چار کی قید لگاتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور حنابلہ کے نزدیک صرف ایک عورت ہی سے شادی مستحب ہے۔ کوئی ۹ تک کے جواز کا قائل ہے۔ اور کسی کے نزدیک نو کی حد بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی، امام ابوحنیفہؒ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

ایک دفعہ جب امام صاحب کے سامنے تعداد ازدواج کا ذکر ہوا تو امام صاحب نے اس قصے کو سن کر کہا "...... بھائی مجھے تو رسول اللہ صلعم کے صحابی جابر بن عبداللہ سے یہ روایت پہنچی ہے کہ ایک بیوی والا شر میں رہتا ہے اور دو بیویوں والا شر ور کا شکار بنتا ہے۔ یعنی مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ روایت سنا کر امام صاحب نے فرمایا کہ میرے ساتھ جب اتفاق نہ ہو وہ تجربہ کر کے دیکھ لے۔ یا شاید جابر ہی کا قول نقل کیا اور کہا کہ ابراہیم کو شائد تجربے کا موقع نہ ملا۔ اور اس کے بعد کہنے لگے کہ رسول اللہ صلعم کا جو برتاؤ عدل و انصاف کا اپنی بیویوں کے ساتھ تھا۔ جو اس برتاؤ کو نہ کر سکے تو وہ ظالموں میں لکھا جائے گا۔ پھر وہ حدیث سنائی جس میں ہے کہ دو بیویوں کے ساتھ انصاف نہ کرنے والا قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گا کہ ایک شق اس کے بدن کا ساقط ہوگا۔ امام نے اس پر اضافہ کیا کہ ایک ہی بیوی پر قناعت۔ اپنے لئے تو میں نے اس مسلک کو اختیار کیا ہے۔ اور فرمایا بھائی بے فکری اور سلامتی کے برابر کوئی چیز نہیں ہے۔ (حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی صفحہ ۱۲۷)

حنابلہ کا بھی تقریباً یہی مسلک ہے۔ ان کے نزدیک بھی صرف ایک ہی عورت سے شادی مسنون ہے۔

قالوا یندب نکاح امراۃٍ واحدۃٍ فلا یعدد الازواج فان فی التعدد خطورۃ عدم العدل فیقع فی المحرم۔

صرف ایک ہی عورت سے شادی مستحب ہے۔ تعدد ازواج کی صورت میں عدل نہ ہو سکنے کا خدشہ ہے
جس سے وہ حرام میں پڑ جائے گا۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۴ صفحہ)

اہل الظاہر جہاں ۹ شادیوں کے قائل ہیں تو کچھ ائمہ مثلاً ابن الصباغ، عمرانی اور بعض شیعہ کے نزدیک کوئی حد نہیں۔ یہ حضرات آیت فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ ... الخ کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں :-

مثنیٰ وثلاث ورباع میں واؤ جمع کے لئے ہے ۔۔۔ اور لغت میں لفظ مثنیٰ سے مراد دو، دو ہیں نہ کہ صرف دو اور اگر کہا جائے کہ دو دو آدمی آئے تو یہ لفظ ایک ہزار کی تعداد میں آنے والے اشخاص کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے کہ وہ دو دو ہو کر آئے۔ جیسے کہ کہا جاتا ہے کہ جاء القوم مَثْنیٰ (لوگ دو دو کر کے آئے)۔ ثلث اور رباع کا مطلب بھی اسی طرح پر ہوگا۔ یہ عربی لغت کا مسئلہ ہے جس میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔ پس آیت مذکور اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ دو دو یا تین تین یا چار چار سے شادی کرے۔ اس میں یہ شرط نہیں کہ اس کے بعد دو دو یا تین تین یا چار چار کا دوسرا گروہ نہ آئے کیونکہ لغت اور عرف کے لحاظ سے یہ شرط ٹھیک نہ ہوگی۔ مثلاً اگر کسی آدمی کے پاس ایک ہزار کا مجمع ہو تو وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ دو دو یا تین تین کر کے آئے۔ اس تاویل کے مطابق لاتعداد شادیاں جائز ہیں۔ اب "و" چاہے جمع کے لئے ہو یا اختیار کے لئے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(نیل الاوطار جلد ششم صفحہ ۱۵۰)

جمہور مفسرین نے اس استدلال کو تسلیم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۲۰۲۔ چنانچہ نواب صدیق الحسن صاحب بھی اس استدلال کو درست تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

فاولیٰ اَنْ یستدلُ علی تحریم الزیادۃ علی الاربع بالسنۃ۔ لا بالقراٰنِ۔ صحیح یہ ہے کہ چار سے زیادہ ازدواج کی حرمت کا استدلال حدیث سے کیا جائے نہ کہ قرآن مجید سے۔ (تفسیر فتح البیان)

اور جس حدیث سے نواب صاحب چار ازدواج کے جواز کے لئے استدلال کرتے ہیں، ائمہ کے نزدیک اس کا ضعف علامہ شوکانی کی زبانی سنئے۔

حدیث قیس بن الحرث وفی روایۃ الحرث بن قیس، فی اسنادہٖ محمد بن عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ فقد ضَعَّفَہٗ غیر واحدٍ من الائمۃ۔

قیس بن الحرث یا دوسری روایت کے مطابق الحرث بن قیس کی حدیث کے ایک راوی محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ ہیں جو اکثر ائمہ کے نزدیک ضعیف ہیں مزید یہ کہ حارث بن قیس کی کوئی دوسری روایت بھی نہیں (نیل الاوطار جلد ششم صفحہ ۱۵۰)

۹۔ مسئلہ کفو

یعنی شادی کے لئے لڑکے کا لڑکی کا برابر حیثیت کا ہونا۔

کفو کا مسئلہ بھی فقہ کے ان مسائل میں سے ہے جسے اسلامی مساوات کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اس اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن مجید تو یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے بھی شادی کی اجازت دیتا ہے: وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ

اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ ہ،-لیکن فقہائے خود مسلمانوں کے درمیان شادیوں میں حسب نسب اور پیشوں کی قید لگا دی ہے ائمہ اربعہ میں سے امام مالکؒ کے مسلک کو روح اسلامی کے زیادہ قریب خیال کیا جاتا ہے - ان کے نزدیک میاں بیوی کا دو امور میں ہم حیثیت کا ہونا ضروری ہے - ایک دین میں یعنی وہ مسلمان ہو فاسق نہ ہو۔ اور دوسرے عیوب سے خالی ہو۔ مال و دولت ، حسب و نسب ، ذات پات اور پیشہ وغیرہ مالکیہ کے نزدیک غیر معتبر ہے۔ امام مالکؒ نے اس آیت سے استدلال فرمایا ہے - اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳) -

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۴ صفحہ ۶۱)

حنفیہ کے نزدیک کفایت نکاح کی شرط ہے اور اس سے مراد عورت اور مرد کا چھ امور میں ایک دوسرے کے برابر ہونا ضروری ہے - (۱) حسب نسب (۲) اسلام (۳) پیشہ (۴) آزادی (۵) دینداری (۶) مال و دولت - ان کے نزدیک غیر عربی یا قریشی سے شادی نہیں کر سکتا - کیونکہ وہ اس کا کفو نہیں ہے اور غیر قریش چاہے وہ عرب ہی کیوں نہ ہو قریش کا کفو نہیں ہو سکتا - ہاں غیر عربی عالم جاہل عربی کا کفو ہو سکتا ہے - پیشہ کے لحاظ سے میاں بیوی میں برابری ضروری ہے عرف کے مطابق - مثلاً اگر درزی کا پیشہ نور بافوں سے اچھا ہو گا تو کوئی نور باف درزی کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا - (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۴ صفحہ ۵۴)

دراصل اس مسئلہ کی بنیاد ہی ایک ضعیف حدیث پر رکھی گئی ہے - جو درج ذیل ہے -

عن ابن عمر انہ صلعم قال العرب اکفاءُ بعضھم ببعضٍ قبیلۃٌ لِقَبِیْلَۃٍ وحیٌّ لحیٍ ورجلٌ لرجلٍ الاحائکٌ وحجامٌ -

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ عرب آپس میں ایک دوسرے کے کفو ہیں - ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا - ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقہ کے لوگوں کے - ایک فرد دوسرے فرد کا مگر نور باف اور حجام - (نیل الاوطار جلد ۶ صفحہ ۱۲۸)

ائمہ کے نزدیک یہ حدیث ہی سرے سے ضعیف ہے - چنانچہ علامہ شوکانی فرماتے ہیں: "فی اسنادہ رجلٌ مجھولٌ وھو الراوی لہٗ عن ابن جریج - اس حدیث کے اسناد میں ایک راوی مجہول ہیں جو ابن جریج سے روایت کرتے ہیں - ابن ابی حاتم سے اس حدیث کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا ھذا کذبٌ لا اصلٌ لہٗ - یہ جھوٹ ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں - ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث باطل ہے" (ایضاً)

۱۰- نکاح شغار

اس سے مراد ادلے بدلے کا نکاح ہے - مثلاً دو خاندانوں میں دو لڑکیوں کا نکاح ایک دوسرے کے خاندان سے بغیر کسی مہر کے ، صرف (بدلے) میں کیا جائے - یا ایک خاندان کی عورتوں کا مہر مثل ایک ہزار روپیہ ہے اور دوسرے خاندان کی عورتوں کا پانچ صد لیکن (بدلے) کی وجہ سے دونوں لڑکیوں کا مہر پچاس پچاس روپے قرار پائے تو یہ صورت بھی نکاح الشغار کے ذیل میں آئے گی -

(بدایۃ المجتہد جلد ۲ صفحہ ۵۷)

ہمارے ہاں اس خلافِ اسلام نکاح کی مثالیں عام ہیں اور ان کے خطرناک نتائج سے بھی لوگ واقف ہیں۔

۱۔ نکاح المتعۃ یہ زیادہ یا کم محدود مدت کا نکاح ہے۔ جمہور ائمہ کے نزدیک حرام ہے۔ شیعہ کے نزدیک جائز ہے۔ بعض حنفیہ نے امام مالکؒ سے اس کا جواز نقل کیا ہے تاہم مالکی مذہب میں اس کا کوئی جواز نہیں ملتا۔ (بدایۃ المجتہد ۲ صفحہ ۵۸ نیل الاوطار جلد ۶ صفحہ ۱۳۶)۔

۲۔ منگنی پہ منگنی اگر کسی کی شادی کی بات طے پا چکی ہے۔ اور ایک دوسرا شخص لڑکی والوں کو اپنی طرف مائل کر کے پہلی منگنی ختم کرا کے خود شادی کر لے تو ائمہ اس نکاح کو جائز قرار نہیں دیتے۔

۱۱۔ طلاق ثلاثہ

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ تین سے کم میں طلاق مکمل نہیں ہوتی اور عامۃ الناس کا اسی پر عمل ہے حالانکہ بیک وقت تین طلاقیں دینا اسلام میں گناہ ہے۔ اصطلاح میں اسے طلاق بدعت کا نام دیا گیا ہے۔ مفتی محمد شفیع (مرحوم) اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:۔

> تین طلاق بیک وقت دینا قرآن و سنت کی رُو سے گناہ اور ایک مکروہ عمل ہے جس تک پہنچنا منشاء قرآن کے خلاف ہے کیونکہ قرآنِ کریم نے واضح طور پر یہ بتلا دیا کہ طلاق دینے کا صحیح اور جائز طریقہ یہ ہے کہ طلاق دو مرتبہ تک دی جا سکتی ہے۔ الطلاق مرتان۔ اس کے بعد تیسری طلاق کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص نے جائز طریقہ سے تجاوز کر کے تیسری طلاق دے ہی دی تو اب اس کی سزا یہ ہے کہ دوسری شادی اور پھر اس سے جدائی کے بغیر ان کا آپس میں تجدید نکاح نہ ہو۔
> (عائلی قوانین پر مختصر تبصرہ صـ۶۳)

دراصل طلاق ثلاثہ بیک مجلس جو بالاتفاق سب کے نزدیک بدعت ہے کی اس طرح مدافعت کی گئی ہے کہ لوگ یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ طلاق کا اسلامی طریقہ ہی یہی ہے۔ مثلاً عائلی قوانین کی اس شق پر علماء نے یہ اعتراض فرمایا:۔

> "بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب کے نزدیک درست ہے لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے۔ حنفی مذہب میں اگر تین طلاقیں بیک وقت دی گئی ہوں تو اس سے طلاق مغلظ واقع ہو جاتی ہے۔ اور مطلقہ عورت اس کا سابقہ شوہر نہ تو عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدت گزر جانے کے بعد اس کے ساتھ پھر نکاح کر سکتا ہے جب تک اس کی تحلیل نہ ہو جائے۔
>
> اس ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے۔ ان حنفی باشندوں کو جو اعتماد ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور مذہب حنفی کے ائمہ و فقہا کے علم و تقویٰ پر ہے وہ اعتماد آجکل کے قانون سازوں پر نہیں ہے۔ (عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات صفحہ ۱۸)

عوام کے لئے اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی، وہ تو پہلے ہی بیک وقت تین طلاق دینے کو اصل طلاق سمجھتے تھے اور جب یہ کہہ دیا جائے کہ یہ حنفی مذہب کے خلاف ہے تو اس میں ان کا کیا قصور ہے کہ وہ اسے غیر اسلامی سمجھنے لگیں، حالانکہ جسے حنفی مذہب کے خلاف قرار دیا جا رہا ہے وہ حنفی مذہب کے نزدیک بھی طلاق دینے کا احسن طریقہ ہے۔ اور جو ائمہ ایسی طلاق کے واقع ہو جانے کے قائل ہیں وہ بھی اسے طلاقِ بدعت ہی سمجھتے ہیں۔ اور اس کے غیر شرعی اثر کو بطور سزا قائم رکھتے ہیں۔

جیسے بھی ہو رسول اللہ صلعم نے طلاق ثلاثہ بیک مجلس کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔ نسائی کی روایت محمود بن لبید سے ہے :-

اَنَّ رَجلاً طَلَّقَ فی عھد رسول اللہ صلعم امرأتہٗ ثلاثاً فغضب رسول اللہ صلعم قال یُلعب بکتاب اللہ و انا بین اظھرکم۔ عہدِ نبویؐ میں کسی شخص نے اپنی بیوی کو بیک مجلس تین طلاقیں دے دیں۔ تو اس کے اس عمل پر رسول اکرم صلعم نے غضبناک ہو کر فرمایا کہ تم لوگ میری موجودگی میں کتاب اللہ سے کھیلتے ہو۔

صرف اس ایک حدیث سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے (اور اس مضمون کی کئی احادیث ہیں) کہ رسول اللہ صلعم کے نزدیک یہ امر کتنا ناپسندیدہ تھا۔

جیسا کہ ابھی ابھی بیان کیا گیا ہے، ائمہ مجتہدین کی ایک جماعت کے نزدیک طلاق دینے کا احسن طریقہ طلاق سُنّت ہی ہے لیکن اگر تین طلاقیں بیک مجلس دے دی جائیں تو طلاق ہو جائے گی اور طلاق دینے والا سنّت کی مخالفت کی وجہ سے گناہگار ہوگا۔ تاہم ائمہ کی اکثریت طلاق بدعت کا جواز کسی صورت میں بھی تسلیم نہیں کرتی۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں :-

اہلِ علم کی ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ ایک ساتھ مُنہ سے ایک سے زیادہ طلاقیں کہنے سے صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔ صاحب البحر نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو موسیٰؓ نے ایک روایت میں حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، طاؤس، عطا، جابر بن زیدؒ، امام الہادی، امام القاسمؒ، امام الباقرؒ، امام الناصر اور احمد بن عیسٰی، عبداللہ بن موسیٰ بن عبداللہ اور حضرت زید بن علی علیہم الرحمۃ کا یہی مسلک نقل کیا ہے اور علمائے متاخرین کا بھی یہی مسلک ہے۔ جن میں امام ابن تیمیہؒ، امام ابن قیمؒ اور محققین کی ایک جماعت شامل ہے۔ ابن المغیث نے کتاب الوثائق میں محمد بن رضاح کا یہی مذہب نقل کیا ہے اور الفخری نے قرطبہ کے علماء کی ایک جماعت مثلاً محمد بن بقی اور محمد بن عبدالسلام وغیرہ ہما سے یہی نقل کیا ہے اور ابن المنذر نے حضرت ابن عباسؓ کے تلامذہ، عطاء، طاؤس اور عمرو بن دینار سے بھی نقل کیا ہے۔ اور ابن المغیث نے حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت الزبیرؓ کا یہی مسلک نقل کیا ہے۔

"امامیہ کے بعض علماء کے نزدیک طلاق متتابع (یعنی اکھٹی تین طلاقیں دینا) سے ایک طلاق بھی واقع نہیں ہوتی۔ اور بعض تابعین سے بھی یہی منقول ہے۔ اور ابن علیہ اور ہشام بن الحکیم سے بھی یہی روایت کیا گیا ہے۔ اور ابو عبیدہ اور بعض اہل الظاہر اور دوسرے اہل العلم کے نزدیک طلاق بدعت بالکل واقع ہی نہیں ہوتی۔"

(نیل الاوطار جلد ششم صـ ۲۳۱)

۱۲۔ حلالہ یا تحلیل

طلاق بدعت کا لازمی نتیجہ حلالہ ہے جیسا کہ مفتی محمد شفیع (مرحوم) نے فرمایا ہے، یہ بات بھی عام طور پر مشاہدہ میں آتی ہے کہ تین طلاق کے بعد جب ہوش آتا ہے تو فریقین آپس میں مصالحت کے لئے تیار ہوتے ہیں مگر بات ہاتھ سے نکل چکی ہوتی ہے۔

(عائلی قوانین پر مختصر تبصرہ صفحہ ۶۳)

یہ بات جو ہاتھ سے نکل چکی ہوتی ہے، اس کا بند و بست حلالہ سے کیا جاتا ہے۔ یعنی جب طلاق دینے والا شخص پشیمان ہوتا ہے اور بیوی کو دوبارہ عقد میں لانا چاہتا ہے جو طلاق مغلظ کے بعد شرعی طور پر نہیں کرسکتا تو مطلقہ عورت کا عارضی نکاح

کسی شخص سے اس شرط پر کیا جاتا ہے کہ وہ ایک دفعہ ہمبستری کے بعد عورت کو طلاق دے دے۔ اس کے بعد پہلا خاوند اس سے تعلقات زوجیت قائم کر لیتا ہے۔
نبی اکرم صلعم نے ایسا کرنے والوں پر اللہ تعالےٰ کی لعنت بھیجی ہے لعن اللّٰہ المحلل والمحلل لہٗ۔ اور حضرت عمرؓ ایسے شخص پر حد جاری کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ایسے نکاح کو جائز سمجھا جاتا ہے اور اس پر باقاعدہ عمل ہوتا ہے۔
دراصل جب تک طلاق بدعت کا خاتمہ نہ ہوگا اس برائی سے جان چھڑانا ناممکن نہیں۔ حنفیہؒ کے نزدیک بھی یہ جائز ہے۔ ہدایہ میں ہے۔

واذا تزوجها بشرط التحليل فالنكاح مكروهٌ لقوله عليه السلام لعن الله المحلل والمحلل لهٗ وهذا هو محملهٗ فان طلقها بعد وطيها حلت للاول لوجود الدخول فى نكاح صحيح۔ (ہدایہ اولین مجیدی ص۳۷۶)

یعنی اگر حلالہ کرنے کی شرط سے کسی عورت سے نکاح کیا تو یہ مکروہ فعل ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لئے حلالہ کیا جائے دونوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجی ہے۔ اور اس سے مراد یہی حلالہ ہے تاہم اس (حلالہ کے نکاح) کے بعد عورت کو ایک ہمبستری کے بعد طلاق دے دی جائے تو وہ پہلے طلاق دینے والے مرد کے لئے حلال ہو گی کیونکہ دخول نکاح صحیح میں ہوا ہے۔ (چاہے حلالہ والی شرط باطل تھی)۔
دوسرے مذاہب کا مسلک تو اس سے بھی عجیب ہے۔ مثلاً حنابلہ سے متعلق یہ روایت ملتی ہے۔

وقد ذكر بعض العلماء الشافعية بهذا المناسبة مسألةً وهى ان الحنابلة يقولون ان الصبى المميز الذى لم يبلغ سنهٗ عشر سنين اذا كان ينصب ذكرهٗ ويغيبه معنى الوقاع فانهٗ اذا تزوج امراةً مطلقةً ثلاثاً واولج فيها ذكرهٗ ثم طلقها فان طلاقهٗ يقع بدون اذن الولى وتحلُّ مطلقةٌ لزوج الاول بدون ان تعتدّ من الصبى لان المعروض ان سنهٗ لم يبلغ عشر سنين۔

اس بارے میں بعض علماء شافعیہ نے حنابلہ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ اگر دس سال سے کم عمر لڑکا جو میاں بیوی کے تعلقات کو سمجھتا ہو۔ طلاق بدعت کی مطلقہ سے شادی اور ہمبستری کے بعد طلاق دے دے تو یہ طلاق ولی کی اجازت کے بغیر بھی صحیح ہے۔ اور مطلقہ اپنے پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے اور لڑکے کی عمر چونکہ دس سال ہے اس لئے عدت کی بھی ضرورت نہیں۔
(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۴ ص۸۳)

۱۳۔ طلاق اور خلع

میاں بیوی کے درمیان اگر کوئی ایسی ناگوار صورت پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے دونوں کا ساتھ رہنا ناممکن ہو جائے تو شریعت نے انہیں یہ اختیار دیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں۔ خاوند طلاق دے سکتا ہے اور بیوی کو خلع کی اجازت ہے۔ امام ابن رشد فرماتے ہیں۔ جعل الطلاق بيد الرجل اذا فرک المرأة وجعل الخلع بيد المرأة اذا فركت الرجل۔ (مرد اگر بیوی سے نفرت کرے تو اسے طلاق کا حق ہے۔ اور خلع عورت کے ہاتھ ہے۔ اگر اسے مرد سے نفرت ہو جائے۔ (بدایۃ المجتہد جلد ۲ ص ۶۸)
جمہور فقہاء کے نزدیک طلاق اور خلع ایک ہی چیز ہے۔ فرق صرف اصطلاح کا ہے۔ مرد کی طرف سے علیحدگی کا مطالبہ ہوگا تو یہ طلاق ہوگی اور عورت کی طرف سے ہو تو خلع۔ واما نوع الخلع فجمهور العلماء على انهٗ طلاقٌ (ایضاً ص۶۹) جمہور علماء کے نزدیک خلع طلاق ہی ہے۔[1]

---

[1] قرآن کریم میں خلع کا لفظ ہی نہیں آیا۔ جس طرح مرد فسخ نکاح کر سکتا ہے اسی طرح عورت کرا سکتی ہے۔ اسی کو طلاق کہتے ہیں۔
(طلوع اسلام)

الخلع نوعٌ مِنْ الطلاقِ لان الطلاقَ تارۃً یکون بدون عوضٍ و تارۃً یکونُ بعوضٍ والثانی هو الخلع ۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۴ ص ۳۹۳)۔

"خلع طلاق ہی کی قسم ہے۔ کیونکہ طلاق کبھی تو بغیر معاوضہ کے ہوتی ہے اور کبھی معاوضہ کے بدلے۔ دوسری قسم کی طلاق کو خلع کہتے ہیں"۔

بعض علماء تو عورت سے خلع کا معاوضہ لینے کو بھی جائز نہیں سمجھتے ہیں۔ ابوبکر بن عبداللہ المزنی فرماتے ہیں:۔

لا یحلّ للزوجِ اَنْ یأخذ مِنْ زوجتہٖ شیاءً (بدایۃ المجتہد جلد ۲ ص ۴)۔

۱۴۔ مفقود الزوج عورت

کسی عورت کا خاوند لاپتہ ہو جائے تو اسے کتنا انتظار کرنا چاہیئے، ائمہ کے درمیان اس مسئلہ میں شدید اختلاف ہے۔ کوئی پوری عمر کہتا ہے۔ کوئی ایک سو بیس سال اور کوئی نوے سال۔ اس مسئلہ میں چونکہ امام مالکؒ کا مسلک سب سے زیادہ ترقی پسندانہ ہے۔ یعنی ایسی عورت کو صرف چار سال تک انتظار کرنا چاہیئے۔ اس لئے تمام مذاہب فقہ نے عملاً اسی کو اختیار کر رکھا ہے۔ مولانا عبدالحئیؒ مفقود الخبر کے مسئلہ میں امام مالکؒ کے مسلک کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے:۔

وعلی ھذا عملی حیث افتیتُ غیر مرۃٍ بقول مالکؒ ظناً منی انہٗ قویٌ مِنْ حیثُ الدلیل و مع قطع النظر عنہٗ تقلید مذہب الغیر جائزٌ عند الضرورۃ اتفاقاً۔ (شرح وقایہ حاشیہ ص ۳۹۲)۔

میرا عمل بھی امام مالک کے مسلک کے مطابق ہے۔ جس کے مطابق میں نے کئی دفعہ فتویٰ دیا۔ کیونکہ اس کی دلیل قوی ہے اور ضرورت کے وقت دوسرے مذہب کی تقلید بالاتفاق جائز ہے۔

۱۵۔ عدّت

عدت کا مقصد ہے:۔

لانقضاء ما بقی مِنْ اثار النکاح معناہٗ ان النکاح لہٗ اثارٌ مادیۃٌ وھی الحملُ۔ "عدت نکاح کے بقیہ آثار کے خاتمہ کے لئے ہے کیونکہ نکاح کے مادی نتائج بھی ہوتے ہیں۔ یعنی حمل"۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۴ ص ۵۱۳)

احکام قرآنی کے مطابق عدت کی مدت تین قروء ہیں اور قروء کے معنی میں ائمہ میں اختلاف ہے۔ حنفیہ اس سے مراد حیض کے دن لیتے ہیں اور دوسرے ائمہ طہر یعنی پاکی کی حالت۔ تفصیل مندرجہ ذیل ہے:۔

الحنفیۃ ۔ ان المراد بالقرء الحیض عندھم بلاخلافٍ فلا تنقضی عدۃ الحرۃ الا بثلاث حیضٍ کو اھلٍ ۔ (قرء سے مراد حیض کے دن ہیں اور عورت کی عدت تین کامل حیض ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۵۴۲)

مالکیہ ۔ فالمشھور ان معناہٗ الطھر مِنْ الحیض فاذا طلقھا فی اخر لحظۃٍ مِنْ طھرھا ثم حاضت بعد فراغہٖ مِنْ لفظ الطلاق بلحظۃٍ حسب لھا ھذا طھراً (قرء سے مراد حالتِ پاکیزگی ہے۔ اس لئے اگر طہر کے آخری لحظہ بھی طلاق ہو گی کہ اس کے فوراً بعد عورت کو حیض شروع ہو جائے تو صرف یہ آخری لحظہ پورا طہر شمار ہو گا۔ شافعیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

یُحسب لھا الطھر الذی طلقھا فیہ ولو بقیت لحظۃً واحدۃً (ایضاً ص ۵۴۵)۔

۱۶۔ جمعہ اور عید کا ایک دن ہونا

جس سال اتفاقاً عید جمعہ کے دن ہو تو اس کے متعلق عوام میں عجیب باتیں مشہور ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ ائمہ کے نزدیک اختلاف یہ ہے :۔

اِذا اتفق یوم عید یوم جمعة فالاصح عند الشافعي ان الجمعة لاتسقط عن اهل البلد بصلوٰة العيد و اما مَنْ حَضَرَ مِنْ اهل القریٰ فالراجح عنده سقوطها عنهم فإذا اصلوا العيد جاز لهم اَنْ يتفرقوا و يتركوا الجمعة ۔

(رحمة الامة فی اختلاف الائمة جلد ا صفحه ۸۰)

اگر عید جمعہ کے دن ہو جائے تو امام شافعیؒ کے نزدیک شہریوں سے جمعہ ساقط نہ ہوگا۔ ہاں دیہاتیوں کے لئے رخصت ہے۔ وہ عید پڑھ کر چلے جائیں اور جمعہ چھوڑ دیں۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک شہریوں کے لئے جمعہ ضروری ہے۔ (ایضاً)

امام احمدؒ کے نزدیک شہریوں اور دیہاتیوں دونوں پہ نماز عید کی وجہ سے جمعہ نہیں ہے وہ اس دن جمعہ کی بجائے صرف ظہر کی نماز ادا کریں۔

وقال عطاءؒ یسقط الجمعة والظهر معاذلك اليوم فلاصلوٰة بعد العيد ۔ (ایضاً)

اور عطاء کے نزدیک جمعہ اور ظہر کی نماز دونوں ساقط ہوں گی۔

(۱۷)۔ صدقۃ الفطر

عوام صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ ہر چھوٹے بڑے پر صدقۃ الفطر واجب ہے حالانکہ ائمہ کے نزدیک اس کے احکام مختلف ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ صرف انہی لوگوں پر واجب ہے جو نماز اور روزہ ادا کرنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ ہر چھوٹے بڑے پر نہیں۔

وعن علی رضی الله عنهٗ انها تجب علی مَنْ اطاق الصلوٰة والصوم ۔

(رحمة الامة فی اختلاف الائمة صفحه ۱۲۱)

امام حسنؒ اور حضرت سعید بن المسیبؒ صرف انہی لوگوں کے لئے واجب سمجھتے ہیں جنہوں نے روزے رکھے اور نمازیں پڑھیں۔

وعن الحسن وابن المسيب انها لا تجب الا علی مَنْ صام وصلی ۔ (ایضاً)

۱۸۔ عبادت پر اُجرت لینا

عبادت پر اُجرت لینا تقریباً تمام ائمہ کے نزدیک ناجائز ہے :۔

الحنفيه : اما الاجارة علی الطاعات فاصول مذهب الحنفيه تقتضی انها غير صحيحة لان كل طاعةٍ يختص بها المسلم لا يصح الاستيجار عليها و يستدلون بحديث روی عنه عليه السلام اقرؤا القرآن ولا تاكلوا به و فی عهد عمر الی عمر بن العاص ان اتخذت موذنًا فلا ياخذ علی الاذان اجراً هذا هو اصل مذهبهم ۔

(الفقه علی المذاهب الاربعة جلد ۳ صفحه ۱۶۹-۷۰)

حنفی مذہب میں عبادات پر اُجرت لینا جائز نہیں کیونکہ ہر وہ عبادت جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہو اس پر اُجرت لینا جائز نہیں۔ وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ قرآن پڑھو مگر اس کے بدلے کچھ نہ کھاؤ۔ نیز اس روایت سے حجت پکڑتے ہیں کہ فاروقِ اعظمؓ نے عمرو بن العاصؓ کو ایسا مؤذن مقرر کرنے کے لئے کہا جو اذان پر اُجرت نہ لے۔ یہی حنفی مذہب کی اصل ہے۔

امام شافعیؒ بھی اسے ناجائز سمجھتے ہیں :-

لا تصح الاجارۃ علی الطاعات التی تجب لھا کالصلوۃ فرضًا کانت او نفلاً۔

جو کچھ کسی کے فرائض میں داخل ہے، مثلاً نماز چاہے فرض ہو یا نفل، اس پر اُجرت لینا ناجائز ہے۔
(ایضاً صفحہ ۱۸۸)

امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک بھی ایسی اُجرت کا کوئی جواز نہیں۔

لا تصح الاجرۃ علی فعل قربت اللہ تعالیٰ کالحج والصلوۃ والاذان والامامۃ و تعلیم القرآن والفقہ والحدیث۔ (ایضاً ص ۱۹۵)

عبادات مثلاً حج، نماز، اذان، امامت، قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم پر اُجرت لینا صحیح نہیں ہے۔

امام مالکؒ اسے مکروہ قرار دیتے ہیں۔ امام شوکانی لکھتے ہیں کہ جمہور ائمہ اسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔

و قد استدل باحادیث الباب مَنْ قال انھا لا تحل الاجرۃ علی تعلیم القرآن وھو احمد بن حنبل و اصحابہٗ و ابوحنیفہ والھادویہ وبہٖ قال عطاء والضحاکؒ بن قیس والزھری واسحٰق و عبد اللہ بن شقیق۔ (نیل الاوطار جلد ۵ صفحہ ۲۸۷)

امام احمد اور ان کے شاگرد نیز امام ابوحنیفہ، ہادویہ، عطا، ضحاک بن قیس، امام زہری، اسحاق اور عبداللہ بن شقیق قرآن کی تعلیم پر اُجرت کو جائز نہیں سمجھتے۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں: روزہ، نماز، حج وغیرہ پر اُجرت لینا جائز نہیں کیونکہ یہ فرضِ عین ہیں۔
(البدائع والصناع جلد ۴ صفحہ ۱۹۱)

علامہ سرخسی فرماتے ہیں :-

اگر نماز تراویح یا دوسری نمازوں کے لئے اُجرت پر امام مقرر کیا گیا تو یہ جائز نہیں کیونکہ نماز تو خود اس کے فرائض میں بھی شامل ہے اس لئے وہ دوسروں سے اس کے اجر کا مستحق نہیں ہو سکتا۔
(المبسوط جلد ۱۶ صفحہ ۳۷)

۱۹۔ مسئلہ قربانی

جمہور ائمہ کے نزدیک قربانی سنّت ہے۔ صرف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے۔ جو اسے سنّت قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اس کا حکم یہ ہے : یثاب فاعلھا ولا یعاقب تارکھا ـــــ کہ قربانی کرنے والا مستحق ثواب ہے۔ لیکن نہ کرنے والے پر کوئی گرفت نہیں۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ جلد ۱ صفحہ ۵۹۳)

امام ابن حزم کے نزدیک جن احادیث سے قربانی کا سنت ہونا ثابت کیا جاتا ہے وہ سب کی سب ضعیف ہیں۔ وہ پانچ احادیث یہ ہیں :۔

(۱) عن ابی رملة عن مخنف بن سلیم ان رسول اللہ صلعم قال بعرفة انّ علی کل اھل بیتٍ فی کلِ عامٍ اضحی۔ حضورؐ نے عرفہ کے مقام پر فرمایا کہ ہر گھر ہر سال قربانی ہے۔

(۲) وعن حبیب بن مخنف عن ابیہ انّہ سمعَ رسول اللہ صلعم یقول بعرفة علی کل اھل بیتٍ انْ یذبحوا فی کل رجب شاةٌ و فی کل اضحی شاةٌ۔ عرفہ میں حضورؐ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا گیا کہ ہر گھر ماہِ رجب اور عید قرباں کے دن ایک ایک بھیڑ ذبح کرنا ہے۔

(۳) عن الحسن انّ رسول اللہ صلعم امر بالاضحی۔ کہ حضورؐ نے قربانی کرنے کا حکم دیا۔

(۴) عن ابن مسیبٍ عن ابی ھریرةؓ ان رسول اللہ صلعم قال من وجد سعةٌ فلیَنْفَحْ کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جسے فراخ دستی ہو وہ قربانی کرے۔

(۵) عن ابی ھریرةؓ قال قال رسول اللہ صلعم مَنْ وَجَدَ سَعةً فَلَمْ یَفحَ فلا یقرب مصلانا۔ کہ جس نے خوش حالی کے باوجود قربانی نہ کی وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے یعنی وہ مسلمان نہیں ہے۔

علامہ ابن حزم ان احادیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ سب ضعیف ہیں اور ان کے ضعیف ہونے کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں :۔

مخنف کی دونوں احادیث، ابی رملة الغامدی کی روایت سے اور حبیب بن مخنف کی روایت سے، تو یہ دونوں راوی مجہول الحال ہیں۔ ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ حسن کی حدیث مرسل ہے۔ اور ابوہریرہؓ کی دونوں احادیث میں ایک راوی عبد اللہ بن عیاش ابن عباس القتبانی ہیں۔ وہ غیر معروف اور غیر ثقہ ہیں۔ (ایضاً)

ان احادیث کو ضعیف قرار دے کر علامہ ابنِ حزم قربانی کے بارے میں صحابہ کا مسلک یوں بیان کرتے ہیں :۔

قال ابو محمد لا یصحُ عن احدٍ منَ الصحابةِ ان الاضحیہ واجبةٌ وصحیحٌ ان الاضحیة لیْستْ واجبةٌ عن سعید بن المسیب والشعبی وانہٗ قال لان اتصدّق بثلاثةِ دراھِم احبُّ الیّ مِن انْ اضحّی۔ (المحلی جلد ۷ صفحہ ۳۵۸)۔

ابو محمد فرماتے ہیں کہ قربانی کے واجب نہ ہونے پر اجماع صحابہ ہے اور صحیح بھی یہی ہے کہ قربانی واجب نہیں ہے۔ سعید بن المسیب اور شعبی سے بھی یہی روایت ہے۔ ان کے نزدیک تین درہم خیرات کر دینا قربانی سے زیادہ بہتر ہے۔ حضرت بلالؓ کا بھی یہی مسلک تھا کہ قربانی کرنے سے خیرات دے دینا زیادہ اچھا ہے۔

نیز۔ عن سعید بن غفلةَ قال قال لی بلالٌ ماکنتُ ابالی لو ضحیت بدیکٍ ولان اخذُ

اَن ثمن الاضحیۃ فاتصدق بہ علی مسکینٍ مُقتِرٍ فھو اَحبُّ اِلیَّ مِنْ اَنْ اُضحّی۔ (ایضاً)
سعید بن غفلۃ سے روایت ہے کہ حضرت بلالؓ نے فرمایا کہ وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ قربانی کے لئے مرغ ذبح کرلیں۔ بلکہ قربانی کی قیمت لے کر اس کا خیرات کردینا ان کے نزدیک افضل ہے۔
حضرت ابوبکرؓ صدیق اور عمرؓ فاروق اس لئے عمداً قربانی نہیں کرتے تھے کہ لوگ اسے واجب نہ سمجھ لیں۔
وقدْ بلغنا اَنّ ابابکر و عمر کان لایضحیان کراھۃ ان یقتدی بھا لیظنّ مَنْ راٰھما انھا واجبۃٌ ـــــ ہم تک یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق اور حضرت عمر فاروقؓ اس خدشے سے قربانی نہیں کرتے تھے کہ لوگ ان کی پیروی نہ کرنے لگ جائیں۔ اور لوگ ان کو قربانی کرتے دیکھ کر اسے واجب نہ سمجھ لیں۔ (کتاب الام جلد ۲ صفحہ ۱۸۹)۔
علامہ شوکانی نے اس روایت کے ساتھ کچھ اور صحابہؓ کے اسماء گرامی بھی دیئے ہیں۔
اخرجہُ البیھقی عن ابی بکر و عمر انھما کان یضحیانِ کراھتۃ اَنْ یظنّ مَنْ راٰھما انھا واجبۃٌ۔ وکذٰلِکَ اَخرج عن ابن عباس و بلال و ابی مسعود و ابن عمر۔
اور یہی ترجمہ ہے اور مزید یہ کہ حضرت ابن عباسؓ۔ حضرت بلالؓ۔ حضرت ابومسعود انصاریؓ اور حضرت ابن عمرؓ بھی اسی وجہ سے قربانی نہیں کرتے تھے۔ (نیل الاوطار۔ جلد ۵ صفحہ ۱۱۹)
علامہ حضرت ابن حزم نے بھی یہ روایت المحلی کی جلد نمبر ۷ صفحہ ۳۵۸ پر دی ہے۔
حضرت ابن عباسؓ نے تو اپنے مسلک کی عملی تفسیر بھی کی تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔
قال عکرمۃ بعثنی ابن عباس بدرھمین اشتری بھما لحماً و قال من لقیت فقل لہٗ ھذہٖ اَضحیۃُ ابن عباس۔ (بدایۃ المجتہد جلد ۱ صفحہ ۴۱۶)
عکرمہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے انہیں دو درہم دے کر گوشت خریدنے کے لئے بھیجا اور فرمایا کہ ہر ملنے والے سے کہہ دینا کہ بس یہی ابن عباسؓ کی طرف سے قربانی ہے۔
ابومسعود انصاریؓ جن کا مسلک نقل ہو چکا ہے کے پاس ہزاروں کی تعداد میں بھیڑ بکریاں تھیں۔ وہ بھی صرف اس لئے قربانی نہیں کرتے تھے کہ لوگ کہیں اسے ضروری نہ سمجھ لیں۔
وقال ابو مسعود الانصاری یغدُ وعلیَّ الف شاۃٍ ویراح فلا اُضحی وخافۃ اَن یَراھا الناسُ واجبۃً۔ (المبسوط جلد ۱۲ صفحہ ۱۲)
قربانی کے دنوں میں بھی اختلاف ہے۔

وقال الشافعی الاوزاعی والاضحی اربعۃ ایامٍ، یوم النحر و ثلاثۃ ایامٍ بعدہٗ وروی عن جماعۃ مِنھُم قالوا الاضحی فی یومٍ واحدٍ وھو یوم النحر خاصۃً وقد قیل الی اٰخر یومٍ مِنْ ذی حجۃٍ وھو شاذٌ۔ (بدایۃ المجتہد جلد ۱ صفحہ ۴۲۲)
امام شافعیؒ اور اوزاعیؒ کے نزدیک قربانی چار دن ہے۔ ایک خاص قربانی کا دن اور تین دن اس کے بعد۔ جمہور علماء صرف ایک دن۔ یعنی عید قربان کے دن کے قائل ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ ذوالحج

کے آخر تک لیکن یہ قول شاذ ہے۔
قربانی کی کھالیں ذاتی مصرف میں لائی جاسکتی ہیں۔ جو صحابہؓ قربانی کرتے تھے وہ کھالوں سے مشکیزے بنا لیتے تھے۔ ویتخذون منها الاسقية۔ (تنویر الحوالک جلد ۱ صفحہ ۱۸۸)
امام ابو حنیفہؒ قربانی کی کھالیں سامانِ ضرورت کے عوض بیچنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور علماء کے نزدیک تو یہ نقدی کے عوض بھی بیچی جاسکتی ہیں۔

یجوز بیعه بغیر الدراهم والدنانیر اعنی بالعروض وقال عطاءٌ یجوز بیعهٗ بکل شیئ دراهم والدنانیر وغیر ذلك۔ بدایة المجتهد جلد ۱ صفحہ ۴۲۴)۔

ابو العالیہ کے نزدیک قربانی کی کھالیں بیچ دینے میں کوئی حرج نہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ گوشت بھی کھاؤ۔ قربانی بھی کرو اور کچھ قیمت بھی واپس لے لو۔ دوسرے ائمہ بشمول ابراہیم نخعی نے ضروریاتِ گھر کے عوض اس کی فروخت کی اجازت دی ہے۔ (المحلی جلد ۷ صفحہ ۳۸۶)

۲۰۔ رہن

جمہور ائمہ کے نزدیک سفر اور حضر دونوں میں رہن جائز ہے۔ لیکن امام داؤد کے نزدیک یہ جواز صرف سفر تک محدود ہے۔ قرآن مجید سے بھی اس مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ وان کنتم علی سفر فرهن مقبوضة (البقرہ)

قال داؤد هو مختصٌ بالسفر۔ امام داؤد نے کہا کہ رہن سفر کے ساتھ مخصوص ہے۔
(رحمة الامة فی اختلاف ائمہ جلد ۲ صفحہ ۷)

۲۱۔ ڈاڑھی کا مسئلہ

ہمارے ہاں اس مسئلہ کی اہمیت حلال و حرام سے بھی زیادہ ہے۔ مودودی مرحوم نے اس غلو کو کم کرنے کی کوشش کی۔ فرماتے ہیں:۔

آپ کا یہ خیال کہ نبی صلعم جتنی بڑی ڈاڑھی رکھتے تھے اتنی بڑی ڈاڑھی سنتِ رسولؐ یا اسوۂ رسولؐ ہے یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عاداتِ رسولؐ کو بعینہٖ وہ سنت سمجھتے ہیں جس کو جاری اور قائم کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے جاتے رہے ہیں۔ مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں بلکہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا، پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت ہے۔ اور ایک خطرناک تحریف فی الدین ہے جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (رسائل و مسائل جلد اوّل ص۳)

حنفیہ کے سوا جمہور ائمہ کے نزدیک داڑھی سنت ہے اور سنت کا حکم یہ ہے:۔

یثابُ فاعلها ولا یعاقب تارکها (الفقه علی المذاهب الاربعة جلد ۱ صفحہ ۵۹۳)
کہ عمل کرنے والا مستحق ثواب ہوگا اور تارک پر کوئی گرفت نہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلامی حکومت میں داڑھی منڈانا جرم ہوگا۔ اگر جرم ہوگا تو اس کی کیا سزا ہوگی۔ ایسا کوئی حکم تو موجود

نہیں ۔ البتہ اگر کوئی دوسرا کسی کی داڑھی زبردستی مونڈھ لے تو اس کا یہ حکم ملتا ہے ۔

وَلِحْيَةُ الكوسج إن كان على ذُقنهِ شعراتٌ معدودةٌ فلاشيئً في حلقه لِانّ وجودهٗ يشينهٗ ولا يزينهٗ و إن كان اكثرمِنْ ذلكَ وكانَ على الخَدِّ والذُّقنِ جميعاً لكِنْ غير متصلٍ ففيه حكومة عدلٍ لان فيهِ بعض الجمالِ وان كان منصلاً ففيه كمالِ الديةِ لانهٗ ليس بكوسج وفيه معنى الجمال وهذا كلهٗ إذا فسَدَ المَنبتُ فان نبتت حتى استوتْ كما كان لايجبُ شيئً لانهٗ لم يبق إشرالجنابةِ وليودبُ على ارتكابهِ ۔ (هدايه اخرين كتاب الديات ص۳۷۴)

کھودسے کی داڑھی جب کہ صرف اس کی ٹھوڑی پر چند بال ہوں کوئی اگر مونڈھ دے تو ایسے شخص پر کچھ لازم نہیں آتا کیونکہ ایسی داڑھی اس کے لئے باعثِ خوبصورتی نہیں ہے ۔ اور اگر داڑھی کے بال زیادہ ہوں اور ٹھوڑی اور رخساروں دونوں پر ہوں لیکن باہم متصل نہ ہوں تو اس کے متعلق دو صاحب عدل فیصلہ دیں گے ۔ کیونکہ ایسی صورت میں داڑھی کچھ باعثِ خوبصورتی ہے ۔ اگر تمام داڑھی باہم ملی ہوئی ہو تو پھر دیت لازم آئے گی ۔ کیونکہ وہ شخص کھودا نہیں بلکہ داڑھی اس کیلئے باعثِ زینت تھی اور یہ احکام صرف اس صورت کیلئے ہیں جب کہ داڑھی کے دوبارہ اگنے کا امکان نہ ہو اور اگر وہ پہلے کی طرح اُگ آئے تو پھر کوئی سزا نہیں کیونکہ جرم کا اثر باقی ہی نہیں رہتا ۔ تاہم ایسے شخص کی تادیب کی جائے گی ۔ (ایضاً)

(بقایا دوسری قسط میں)

طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ

غیر ممالک کے لئے بحری اور ہوائی ڈاک کے چندہ کی تفصیل

(۱) پاکستانی خریدار ــــــــــــ ۳۶/- روپے

(۲) غیر ممالک ــــ (بذریعہ بحری ڈاک ـــ رجسٹرڈ) ـــ ۳½ پونڈ ـــ ۷۵/- ″

(۳) غیر ممالک ــــ (بذریعہ ہوائی ڈاک ـ رجسٹرڈ) ـ برائے :ــــــ

(۱) برطانیہ ـ فرانس ـ سوئٹزرلینڈ وغیرہ	۷۵/-	+	۵۰/-	=	۱۲۵/-	″
(۲) دبئی ـ بحرین ـ کویت ـ سعودی عرب وغیرہ	۷۵/-	+	۲۵/-	=	۱۰۰/-	″
(۳) لیبیا ـ کینیا ـ یوگنڈا ـ جنوبی افریقہ	۷۵/-	+	۴۵/-	=	۱۲۰/-	″
(۴) امریکہ ـ کینیڈا وغیرہ	۷۵/-	+	۱۱۰/-	=	۱۸۵/-	″
(۵) نیوزی لینڈ	۷۵/-	+	۸۵/-	=	۱۶۰/-	″
(۶) انڈیا	۷۵/-	+	۳۵/-	=	۱۱۰/-	″

نوٹ :- طلوع اسلام کے لئے جملہ رقوم مثلاً منی آرڈر، چیک، بینک ڈرافٹ وغیرہ "ناظم ادارہ طلوعِ اسلام" کے نام بھیجی جائیں ۔ کسی کے نام سے کوئی رقم نہ بھیجی جائے ۔ رقم کو (A/C 2650-57) حبیب بینک (برانچ مین مارکیٹ) گلبرگ II لاہور میں جمع کرنے کی ہدایت کے ساتھ پتہ انگریزی زبان میں (MANAGER IDARA TOLU-E-ISLAM, 25-B GULBERG II, LAHORE, PAKISTAN) لکھا جائے ۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ـ ۲۵/ بی ـ گلبرگ ۲ لاہور

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

(۱۶ر مارچ تا ۱۲ر اپریل ۱۹۸۰ء)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم	روپے	
۱۔ عبدالرشید صاحب۔ لیاقت آباد۔ کراچی	۱۰۰/-	۲۴۷۰
۲۔ سید جوہر علی شاہ صاحب۔ نوانکلی۔ مردان	۱۰۰/-	۲۴۷۱
۳۔ بزمِ طلوعِ اسلام۔ لاہور چھاؤنی	۱۰۰۰/-	۲۴۷۲ اور ۳۰۱۱
۴۔ معرفت بزمِ طلوعِ اسلام۔ کراچی	۴۶,۸۴۵/-	۲۴۷۳ تا ۲۴۷۵، ۳۰۰۱ تا ۳۰۰۵، ۳۰۳۳ تا ۳۰۳۵، ۳۰۵۷ اور ۳۰۵۸، ۳۰۷۷ تا ۳۰۸۵، ۳۰۸۷ تا ۳۰۹۳
۵۔ حاجی چوہدری صادق صاحب معرفت ڈاکٹر لیفٹیننٹ ظفر علی صاحب۔ ڈڈیال آزاد کشمیر	۴۰۰/-	۳۰۰۶
۶۔ حاجی غلام حسین صاحب " " " "	۴۵۰/-	۳۰۰۷
۷۔ چوہدری محمد عالم صاحب " " "	۱۰۰/-	۳۰۰۸
۸۔ حاجی پہلوان صاحب " " " "	۵۰/-	۳۰۰۹
۹۔ نام کی اشاعت نہیں چاہتے	۱۵۰/-	۳۰۱۰
۱۰۔ معرفت بزمِ طلوعِ اسلام۔ مردان	۲۵۵/-	۳۰۱۲ تا ۳۰۱۵
۱۱۔ نام اور پتہ ظاہر نہیں کیا۔ (از لاہور)	۱۰۰/-	۳۰۱۶ اور ۳۰۶۲
۱۲۔ لیاقت حسین صاحب۔ یونیورسٹی نیو کیمپس۔ لاہور	۱۰/-	۳۰۱۷
۱۳۔ فدا محمد صاحب۔ مغلپورہ۔ لاہور	۱۰۰/-	۳۰۱۸
۱۴۔ مس آر۔ خاں صاحبہ۔ بحرین	۵۱۶/-	۳۰۱۹
۱۵۔ معرفت بزمِ طلوعِ اسلام۔ لاہور	۶۵۰/-	۳۰۲۰ اور ۳۰۳۶ تا ۳۰۳۸
۱۶۔ معرفت بزمِ طلوعِ اسلام۔ جلالپور جٹاں	۴۰۲۴/-	۳۰۲۱ تا ۳۰۲۷
۱۷۔ احبابِ کویت معرفت محمد سرداز خاں صاحب	۳۰۰/-	۳۰۲۸
۱۸۔ غلام محمد اعوان صاحب۔ پنج گستی	۳۰۰/-	۳۰۲۹

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم	روپے	
۱۹۔ ڈاکٹر لیفٹیننٹ کمانڈر (ریٹائرڈ) محمد حمزہ ہاشمی صاحب۔ کراچی	۱۰۰/-	۳۰۳۰
۲۰۔ محمد اسلم صاحب۔ گوجرہ	۱۰۰/-	۳۰۳۱
۲۱۔ ڈاکٹر مسز جمیل صاحبہ۔ اسلام آباد	۱۰۰۰/-	۳۰۳۲
۲۲۔ عبدالاحد صاحب۔ نوڈبی۔ مردان	۱۰۰/-	۳۰۳۹
۲۳۔ محمد ارشاد صاحب ٹیچر۔ چاہان۔ مری	۲۵/-	۳۰۴۰
۲۴۔ معرفت بزمِ طلوعِ اسلام فیصل آباد	۶,۴۴۷/-	۳۰۴۱ تا ۳۰۵۶
۲۵۔ ملک حنیف وجدانی صاحب۔ مری	۱۰۰/-	۳۰۵۹
۲۶۔ مسز ظفر سعید صاحبہ۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۳۰۶۰
۲۷۔ عرفان عباسی صاحب۔ پھپھڑیل۔ مری	۱۰۰/-	۳۰۶۱
۲۸۔ معرفت بزمِ طلوعِ اسلام۔ ملتان	۲۰۰/-	۳۰۶۳، ۳۱۱۹
۲۹۔ عطاء اللہ حبّل صاحب۔ جوہنسبرگ S.A.	۱۱۹۲/۶۵	۳۰۶۴
۳۰۔ معرفت بزمِ طلوعِ اسلام۔ لندن	۱۹۶۰/-	۳۰۶۵ تا ۳۰۷۱
۳۱۔ کلیم یو۔ خاں صاحب۔ QUE: کینیڈا	۱۰۰۰/-	۳۰۷۲
۳۲۔ محمد اشرف درّانی صاحب و دیگر احباب معرفت اشفاق احمد صاحب۔ CLEVELAND U.K.	۳,۴۰۰/-	۳۰۷۳ اور ۳۰۷۴
۳۳۔ بیگم چوہدری عبدالکریم صاحبہ۔ ننکانہ صاحب	۵۰/-	۳۰۷۵
۳۴۔ عطاء ایم۔ چوہدری صاحب۔ راولپنڈی	۵۰۰/-	۳۰۷۶
۳۵۔ ایم۔ ایم شکیل صاحب۔ کراچی	۲۰۰/-	۳۰۸۶
۳۶۔ نام کی اشاعت نہیں چاہتے۔ (از لاہور)	۳۵۰/-	۳۰۹۴
۳۷۔ پوردل عرف صدر بابا صاحب۔ ترکئی ضلع مردان	۱۰۰/-	۳۰۹۵
۳۸۔ معرفت مقبول شوکت چودھری صاحب۔ گوجرانوالہ	۱۰۰۰/-	۳۰۹۶ تا ۳۱۱۸

میزان = ۷۶،۳۷۴/۶۵ روپے

سابقہ میزان = ۳،۰۱،۶۵۷/۶۸ "

کل میزان = ۳،۷۸،۰۳۲/۱۳ "

جہنمِ ارضی

پرویز صاحب کا ایک درسِ قرآن

★★★★★

پرویز صاحب کا ہفتہ واری درسِ قرآن مجید ہمارے دور کے نوادرات میں سے ہے۔ اس سے قرآن کی عظمت اس طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ انسان بلا ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ لاریب یہ خدا کا کلام ہے۔ انہوں نے ان درسوں کا سلسلہ ۱۹۵۳ء میں کراچی میں شروع کیا۔ وہ درس مختلف موضوعات پہ ہوتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں وہ لاہور منتقل ہو کر آگئے تو انہوں نے قرآن مجید کا مسلسل درس شروع کیا۔ ۱۹۶۸ء میں ان کا پہلا دور ختم ہوا تو بارِ دیگر ان کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ آج کل سورۂ السباء (۳۴) بائیسواں پارہ زیرِ تدریس ہے۔ یعنی بارہ سال کے عرصہ میں ہم بائیسویں پارہ تک پہنچ پائے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ درس کس قدر مفصل اور مشرح ہوتے ہیں۔ یہ درس (TAPES) میں ریکارڈ کر کے محفوظ کر دیئے جاتے ہیں اور انہی کے ذریعے درس کا سلسلہ اندرونِ اور بیرونِ پاکستان متعدد مقامات پہ مسلسل جاری ہے۔ نیز پرویز صاحب کے ایک قدیمی رفیق، ملک ظہور احمد صاحب انہیں بتدریج ضبطِ تحریر میں بھی لا رہے ہیں۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

یوں تو ان کا ہر درس منفرد ہوتا ہے لیکن ۲۸ مارچ کو جو موضوع زیرِ تدریس آیا وہ اس قدر اہم تھا کہ درس کے بعد، اکثر قارئین نے کہا کہ اسے کسی طرح طلوعِ اسلام میں بھی شائع کر دیا جائے تاکہ جن لوگوں تک یہ بذریعہ ٹیپس نہ پہنچ سکے وہ بھی اس سے استفادہ کر سکیں، کسی خطاب یا درس کا ضبطِ تحریر میں لانا مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور اگر اسے کسی طرح منضبط بھی لیا جائے تو تحریر میں تقریر کی سی بات پیدا نہیں ہو سکتی —— اور پھر تقریر بھی پرویز صاحب کی! بایں ہمہ، کوشش کی گئی ہے کہ درس کا اوریجنل انداز نہیں تو کم از کم اس کا مفہوم سامنے آجائے۔ جن احباب کے پاس کیسٹ ریکارڈر ہوں، اور وہ چاہیں تو انہیں ان درسوں کے کیسٹ قیمتاً مہیا کئے جا سکتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد آپ درس ملاحظہ فرمائیے:-

درسِ قرآن مجید

عزیزانِ گرامی قدر!

سلام و رحمت۔

آج مارچ ۱۹۸۰ء کی ۲۸ تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۂ السباء کی آیت ۳۲ سے ہونا ہے۔ جیسا کہ میں نے سابقہ

درس کے آخر میں کہا تھا اس آیت میں ایک بڑا اہم موضوع ہمارے سامنے آتا ہے ـــــ یہ موضوع ہے جہنم میں لیڈروں اور عوام کی باہمی گفتگو۔ آقاؤں اور غلاموں کے مکالمات، مذہبی راہنماؤں اور ان کے معتقدین کی بحث وتمحیص بلکہ طعن و تشنیع۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس موضوع تک پہنچیں خود جہنّم کے متعلق ایک تمہیدی تعارف ضروری ہے۔ آخرت کی زندگی اور وہاں کی جنّت اور جہنّم اور دیگر کوائف جو قرآن کریم میں مذکور ہیں ان پر ہمارا ایمان ہے۔ اُخروی زندگی پر ایمان کے بغیر تو کوئی شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ تو خود خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا لاینفک مرحلہ ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے جنت اور جہنّم کی تمہید اسی دنیا سے شروع ہو جاتی ہے۔ جنّتِ ارضی کے متعلق تو کسی بعد کے درس میں ذکر آئے گا۔ آج کے درس میں گفتگو اس دنیا کے جہنم سے متعلق ہو گی۔ ہمارے ہاں اس دنیا کے جہنم اور اس کے عذاب کے متعلق کبھی گفتگو نہیں ہوتی۔ سارے وعظ اور نصائح۔ تمام تنذیر و ترہیب، اُخروی جہنّم سے متعلق ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اوّل تو ان تنذیرات کا کچھ اثر نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو وقتی اور ہنگامی۔ اس لئے کہ (یوں سمجھئے کہ) انسان کی کچھ "فطرت" ایسی واقع ہوئی ہے کہ جو مصیبت یا آفت دیر میں آنے والی ہو، اس کا احساس زیادہ اثر انگیز نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں اس قسم کے خیالات عام ہیں کہ ـــــ مترس از بلائے کہ شب درمیاں ـــــ بلکہ یوں کہ

اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

سلیم پانی پتی (مرحوم) نے تو اسی خیال کو زیادہ شوخ اور طرار انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے کہ ؎

وہ تصور دحور، بجا۔ بجا، یہ شباب وحسن غلط، غلط مگر اس کا کوئی جواب دے، کہ یہ نقد ہے وہ اُدھار ہے

جس طرح انسان نقد کی طرف تیزی سے لپکتا ہے اسی طرح وہ سامنے کھڑی مصیبت سے زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (انسان عجلت پسند واقع ہوا ہے)، تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے۔ قانونِ مکافاتِ عمل کی نتیجہ خیزی کے سلسلے میں یہ طریق زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے کہ اس دُنیا کے جہنم کے شعلوں کو سامنے لایا جائے۔ سورۂ عنکبوت میں ہے کہ یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ۔ اے رسول یہ تم سے کہتے ہیں کہ جس عذاب کی تم دھمکیاں دیتے رہتے ہو، اسے جلدی سے لاکر دکھاؤ۔ جس جہنّم سے تم ڈراتے رہتے ہو وہ جہنّم ہے کہاں؟ ان سے کہو: وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (۲۹/۵۴) وہ جہنم تو تمہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اگر وہ تمہیں نظر نہ آئے، یا یوں کہئے کہ اگر تم اسے دیکھنا ہی نہ چاہو، اپنی آنکھیں بند رکھو، تو اس جہنم کو تمہیں کس طرح دکھایا جائے؟

خضر کیونکر بتائے کیا بتائے؟ اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

لیکن اگر تم اسے نہیں دیکھتے: وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ (۸۲/۱۶) تو تم جہنّم کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو۔ وہ تو تمہیں ہر لمحہ اور ہر آن دیکھ رہا ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو اپنے مخصوص دلنشیں انداز میں متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

سخن زنامہ ومیزاں دراز تر گفتی ہزار حیف نہ بینی قیامت موجود!

صرف جہنّم ہی نہیں بلکہ پوری کی پوری قیامت جس میں ہر انسان کے، ہر سانس میں اعمال تُلتے رہتے ہیں۔ دوسرے مقام پر وہ اسی خیال کو زیادہ شگفتہ پیرائے میں (بلکہ یوں کہئے کہ نشتر انہ انداز سے) بیان کرتے ہیں جب کہتے ہیں:

نہ دوزخ واعظِ کافرگرے گفت — حدیثے خوش تراز وے کافرے گفت
"نہ داند آں غلام، احوالِ خود را — کہ دوزخ را مقامِ دیگرے گفت"

واعظ، جس کا مشغلہ ہی کافرگری ہوتا ہے' ایک دن دوزخ کے متعلق بڑی لمبی چوڑی داستانیں بیان کر رہا اور لوگوں کو اس کے عذاب سے ڈرا رہا تھا۔ وہیں کہیں' ایک کونے میں ایک کافر کھڑا تھا۔ وہ اس واعظ کی باتیں سن کر مسکرایا اور کہنے لگا کہ یہ غلام اپنے احوال سے کس قدر بے خبر ہے جو دوزخ کو دوسرے لوگوں کا مقام بتا رہا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ خود دوزخ کے اندر کھڑا ہے۔ (اس میں "غلام" کے لفظ میں ساری حقیقت سمٹ کر آگئی ہے)

لیکن اسے معلوم کس طرح سے ہو؟ اسے جہنم کا عذاب دکھائی کس طرح سے دے؟ وہ تو اُسے دکھائی دیتا ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے؛ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (۷۹/۳۶) دیکھنے والے کے لئے جہنم ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ دیکھنے والے جس عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ ان کے لئے اس میں نہ موت ہوتی ہے نہ زندگی: ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (۸۷/۱۳) چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دیتی ہے لیکن ان کی بدبختی کہ وہ مر بھی نہیں سکتے: وَيَأْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (۱۴/۱۷)۔ غالب نے شاید ایسی ہی کیفیت میں کہا تھا کہ ؎

مرتا ہوں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

وہ شدتِ اضطراب سے ہزار بار چاہیں گے کہ اس جہنم سے کسی طرح نکل جائیں لیکن وہ اس سے نکل نہیں سکیں گے؛ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا (۲۲/۲۲)۔ فرطِ غم واندوہ سے تنگ آکر وہ ہزار بار ارادہ کریں گے کہ وہاں سے نکل جائیں لیکن وہ نکل نہیں سکیں گے۔ وہ جب بھی نکلنے کی کوشش کریں گے انہیں دھکے دے کر اس میں واپس دھکیل دیا جائے گا۔ یہ اس لئے کہ یہ جہنم تو قوم یا معاشرہ کی اجتماعی بداعمالیوں کا دہکایا ہوا ہوتا ہے۔ ایک فرد کی انفرادی کوشش اس سے نکلنے میں کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے؟ جہنم میں تو انسانوں کے گروہ داخل ہوتے ہیں؛ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا (۳۹/۷۱)۔ اس میں تو قومیں داخل ہوتی ہیں (۷/۳۸)۔ اس لئے جب پوری کی پوری قوم جہنم میں ہو تو قوم کے افراد اس عذاب سے کس طرح بچ سکیں گے؟ نہ ہی یہ صورت ہوگی کہ جہنم کے اندر کوئی گوشہ جنت کا ہو جہاں یہ افراد سمٹ کر بیٹھ جائیں!

اب سوال یہ ہے کہ یہ جہنم ہے کیا اور اس کے عذاب سے مفہوم کیا ہے؟ جہنم عبرانی زبان کا لفظ ہے اور دو لفظوں سے مرکب ——— جی اور ہنّوم ——— جی کے معنے وادی ہیں اور ہنّوم کسی آدمی کا نام تھا۔ وادیٔ ہنّوم یروشلم کے جنوب میں ایک مشہور وادی تھی جس میں زمانۂ قدیم میں مولوک دیوتا کے حضور انسانوں کو ذبح کر کے اور ان کی لاشوں کو جلا کر قربانی پیش کی جاتی تھی۔ لہٰذا، جہنم سے مراد ہے وہ قربان گاہ جہاں انسانیت کو ذبح کیا جائے اور تکریم و شرفِ آدمیت کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا جائے۔ اس دیوتا کے لئے "مولوک" کا لفظ بھی بڑا معنے خیز ہے۔ یعنی وہ جسے دوسرے انسانوں پر حقِ ملکیت حاصل ہو۔ وہ مالک (MASTER)۔ صاحبِ اقتدار ہو اور دوسرے انسان اس کی ملک' اس کے تابع فرمان۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ قرآنِ کریم نے جہنم کے داروغے کا

نام بھی مالک بتایا ہے۔ سورہ زخرف میں ہے: وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ۔ وہ آواز دیں گے کہ اے مالک! اپنے رب سے کہو کہ وہ ہمارا قصہ تمام کر دے۔ اس مسلسل عذاب سے موت ہزار درجہ بہتر ہے۔ وہ کہے گا: قَالَ إِنَّكُمْ مَاكِثُونَ (۴۳/۷۷)۔ یہاں تم مر نہیں سکتے۔ تمہیں اسی عذاب میں مبتلا رہنا ہوگا۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے ایک لفظ میں پورے کے پورے جہنم کا نقشہ کس طرح مرکوز کر کے رکھ دیا ہے۔ یعنی جس معاشرے میں کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو دوسرے انسانوں پر کسی قسم کا اقتدار حاصل ہو وہ معاشرہ جہنمی ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے بنیادی طور پر اعلان کر دیا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷/۷۰)۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ لہٰذا جس معاشرہ میں تکریم انسانیت پر کسی قسم کا بھی حرف آتا ہو۔ جس معاشرہ میں کسی فرد کو بھی ذلیل کیا جائے یا وہ اپنے آپ کو ذلیل محسوس کرے۔ وہ معاشرہ جہنمی ہے۔ جنتی معاشرہ وہ ہے جس میں نہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم ہو اور نہ ہی محتاج۔ یہی دین کی غایت اور اسلام کا مقصود ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں جنتی معاشرہ وہ ہے جس میں برملا کہا جا سکے کہ ؎

کس درین جا سائل و محروم نیست　　عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

کسی انسان کا دوسرے انسانوں کا محکوم یا دست نگر ہونا وجہ تذلیلِ انسانیت ہے۔ قرآن کریم نے لَهُمْ خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۲/۸۵)۔ یعنی ذلت و خواری کو عذاب النار سے تعبیر کیا ہے (۲/۸۵، ۳/۱۹۱)۔ جس معاشرے میں کسی ایک ابن آدم کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے اس معاشرہ سے خدا روٹھ جاتا ہے اور اسے ہلاکوؤں اور چنگیزوں کے سپرد کر دیتا ہے کہ جاؤ اور اس پوری کی پوری قوم کو ذلت و خواری کے جہنم میں جھونک دو۔ خدا کا بسیرا اس معاشرہ میں ہوتا ہے جہاں کے گورنر سے ایک دفعہ ایک ذمی کے لئے نادانستہ زبان سے نکل گیا: اخزك اللہ ـــــ خدا تجھے ذلیل کرے۔ بعد میں جب اس غلطی کا احساس ہوا تو بابِ خلافتِ فاروقی میں جھکے ہوئے سر اور پُرنم آنکھوں سے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ گورنر بڑا پاکباز اور نہایت قابل اور بڑا معتمد تھا۔ رفقاء نے ہزار سمجھایا کہ سہواً تمہاری زبان سے ایک لفظ نکل گیا ہے۔ تمہاری ندامت کے آنسوؤں نے اس داغ کو دھو کر صاف کر دیا ہے۔ تم اپنا استعفیٰ واپس لے لو۔ لیکن اس نے ایک بھی مان کر نہ دی اور کہا کہ کوئی چھوٹا موٹا جرم ہوتا تو میں اپنے دل کو تسلی بھی دے لیتا کہ اشکِ ندامت اس کی تلافی کر دیں گے۔ لیکن تذلیلِ انسانیت ایسا سنگین جرم ہے جس کی میرے نزدیک تلافی ہو نہیں سکتی۔

خدا کا مسکن ایسا ہی معاشرہ ہوتا ہے۔ اسی کو جنتی معاشرہ کہتے ہیں جس کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ (۱۰/۲۶)۔ اس میں کوئی شخص روسیاہ نہیں ہوگا۔ کسی کو ذلت کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جائے گا۔ اس کے برعکس جہنم ہے: وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا (۲۵/۶۹) اس معاشرہ میں انسانوں کی توہین ہوگی۔ انسانیت کی تذلیل ہوگی۔ "تذلیل و تحقیر" میں ہر قسم کا عذاب آگیا۔

قرآن مجید میں جہنم کے لئے جحیم کا لفظ بھی آیا ہے۔ جحیم کے معنی ہیں وہ مقام جہاں آکر کوئی رُک جائے۔ آگے نہ بڑھ سکے۔ قرآن مجید کی رو سے انسانی زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی اور اوپر کو ابھرتی چلی آرہی ہے

وہ اوّلیں جرثومۂ حیات سے مختلف منازل طے کرتی پیکرِ انسانیت تک پہنچی ہے۔ جن انواع میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی وہ آگے بڑھ گئیں جس نوع میں یہ صلاحیت نہ رہی وہ وہیں رک گئی۔ انسانوں کی اس دنیا کی زندگی اس کاروانِ حیات کی آخری منزل نہیں۔ اسے آگے بڑھنا اور زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنا ہے۔ یہ سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا۔ موجودہ سطحِ زندگی پر اس کا طریقہ یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق عالمگیر انسانیت کی منفعت کے لئے عام کر دیا جائے۔ اس سے اس کی دُنیا کی زندگی بھی جنّت آشنا ہو جائے گی اور اُخروی زندگی بھی فردوسِ بداماں۔ ظاہر ہے کہ ایسا کچھ اجتماعی نظام کی رو سے ہی ہو سکے گا۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو مصافِ زندگی میں صاحبِ اختیار بنایا ہے کہ جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے اور جو چاہے پیچھے رہ جائے۔ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (۷۴/۳۷) فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے کافر اور مؤمن دونوں کے لئے میدان کھلا ہے۔ کافر ان قوتوں کو اسی دنیا کی خوشگواریوں کے حصول کے لئے صرف کرتا ہے کیونکہ وہ اُخروی زندگی پر ایمان ہی نہیں رکھتا۔ لیکن مؤمن انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرتا ہے تو اس کی دنیاوی زندگی بھی حسین اور خوشگوار ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی ذات نشوونما پاکر اگلی زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے ان کے متعلق کہا، فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا۔ انہیں ان کے حسنِ عمل کا دوھرا صلہ ملے گا: وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ (۳۴/۳۷)۔ لفظ غرفات بڑا ہی جامع ہے۔ اس میں خوشگواریوں کی کثرت، رفتار کی تیزی اور مدارج کی بلندی سب شامل ہیں۔ اور آمنون کے اضافہ سے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ ہر قسم کے خوف وخطر سے مأمون ہوں گے۔ قرآن کریم نے جماعتِ مؤمنین کی ارضی جنّت کا نقشہ انہی الفاظ میں کھینچا ہے: انہیں وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ کہہ کر پکارا ہے (۵۶/۱۰) یعنی سب سے آگے بڑھ جانے والے۔ آگے بڑھ جانے والے بھی اور (اعلون) بلند تر بھی۔

مؤمنے بالائے ہر بالا ترے غیرتِ او برنتابد ہمسرے

ان کے برعکس جو قوم مصافِ حیات میں پیچھے رہ جائے ان کی زندگی جحیم (جہنّم) کی ہوتی ہے، لَاجَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ (۱۶/۶۲)۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ لوگ اہلِ جہنّم ہیں کیونکہ یہ دوسروں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

زندگی جوئے رواں است، و رواں خواہد ماند ایں مئے کہنہ جواں است، و جواں خواہد ماند

زندگی کی مثال ایک ندی کی سی ہے۔ ندی اس وقت تک ندی کہلاتی ہے جب تک اس کے پانی میں روانی رہے۔ جب اس کا پانی کسی جگہ رک جائے تو وہ ندی نہیں رہتی، جوہڑ بن جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس پانی میں سڑاند اور تعفن پیدا ہو جاتا ہے حتّٰی کہ اس کا وہی پانی جو ممدِ حیات تھا، مہلک ہو جاتا ہے۔

جو قوم زندگی کی شاہراہ پر رک کر کھڑی ہو جائے اس کی یہی حالت ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی جہنّم کی ہوتی ہے۔ اور جس کی اس دُنیا کی زندگی جہنّم کی ہو اس کی اُخروی زندگی بھی جہنّم کی ہوتی ہے۔

وہ کل کے غم وعیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

اور یہی ہے وہ جہنم جس میں لیڈروں میں اور عوام ہیں۔ غلاموں میں اور ان کے آقاؤں میں۔ مذہبی راہ نماؤں اور ان کے متبعین میں وہ مکالمات ہوتے ہیں جن کے تذکرے سے میں نے اس درس کا آغاز کیا ہے
جیساکہ میں پہلے بھی کئی بار واضح کر چکا ہوں قرآن کریم نے جنت اور جہنم (اور اُخروی زندگی کی دیگر کیفیات) کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ تمثیلی انداز میں الفاظ کے معنی (LITERAL) نہیں لئے جاتے بلکہ ان کا مجازی مفہوم لیا جاتا ہے۔ ان مکالمات سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اس عذاب کا ذمہ دار کون ہوتا ہے، جو کسی قوم پر مسلط ہو جاتا ہے۔

مکالمات

ان مکالمات میں قرآن کریم نے جن دو گروہوں کو ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا کیا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ کو "مستکبرین" کہہ کر پکارا گیا ہے اور دوسرے کو "مستضعفین"۔ یہ اصطلاحات بڑی جامع ہیں۔ سمجھنے کے لئے مستکبرین وہ لوگ ہوں گے جنہیں دوسروں پر کسی قسم کا اقتدار اور بالادستی حاصل ہو۔ اور مستضعفین وہ لوگ جنہیں کمزور بنا دیا گیا ہو اور وہ بالادست طبقہ کے مطیع و فرماں بردار ہوں۔ بالادست طبقے میں قوم کے لیڈر، مذہبی راہنما، اور ارباب اقتدار سب شامل ہیں اور مستضعفین کا طبقہ عوام پر مشتمل۔ مکالمات کی ابتداء سورہ السبا کی آیت اکتیس سے یوں ہوتی ہے:۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ . . . . لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ (۳۴/۳۱)

تم ذرا چشم تصور کو کام میں لاکر اس منظر کو دیکھو جب یہ ظالمین خدا کے حضور کھڑے ہوں گے اور آپس میں جھگڑ رہے اور اپنی سوز ناک تباہی کا الزام ایک دوسرے پر دھر رہے ہوں گے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور اس دعوتِ حق و صداقت کو قبول کر لیتے۔
اس کے جواب میں :۔

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا . . . . مُجْرِمِينَ (۳۴/۳۲)۔

ان کے لیڈر ان سے کہیں گے کہ ہمیں کیوں مطعون کرتے ہو؟ جب سیدھا راستہ تمہارے سامنے آگیا تھا تو کیا ہم نے تمہیں روکا تھا کہ اس راستے کو اختیار نہ کرنا۔ تم خود ہی جرائم کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے۔
اب خواہ مخواہ الزام ہم پر دھر رہے ہو؟
نظر بظاہر یہ جواب معقول دکھائی دیتا ہے لیکن :۔

وَقَالَ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا . . . . نَّجْعَلَ لَهُ أَندَادًا (۳۴/۳۳)۔

اس پر عوام ان سے کہیں گے کہ تم کیا کہہ رہے ہو کہ تم نے ہمیں اس سے نہیں روکا تھا اور ہم نے خود ہی اس سے انکار کیا تھا؟ تم رات دن اس قسم کی چالیں چلتے اور فریب کاریاں کرتے رہتے تھے جن سے ہم اس صحیح راستے کے قریب تک نہ پھٹک سکیں۔ تم اس قسم کے احکام صادر کرتے اور قوانین نافذ کرتے رہتے تھے جن سے ہم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے بجائے تمہاری اطاعت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ ہمارے لئے اس کے سوا چارہ کار ہی نہیں تھا۔ کیا اس کے بعد بھی تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم نے ہمیں اس راستے کی طرف آنے سے نہیں روکا تھا؟

دوسرے مقام پر اس بالادست طبقے کی سازشوں کو بڑے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ فرمایا: وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ۔ ان کی ان ساری کارستانیوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ عوام کسی نہ کسی طرح ان کے ساتھ ہیں نہیں اپنے ساتھ رکھنے کا مؤثر ترین طریق یہ تھا کہ جس روش پر چلنے سے وہ خوش ہوں انہیں اسی روش پر چلنے دیا جائے (وَلِيَرْضَوْهُ)۔ اس روش کی جائز بیتوں اور دلکشیوں میں اور اضافہ کر دیا جائے: وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ (۶/۱۱۳)۔ وہ لوگ جائز و ناجائز جس جس طریق سے بھی دولت کماتے تھے انہیں ایسا کرنے دیا جائے تاکہ وہ ان بڑوں کی اس قسم کی حرکات پر انہیں ٹوک نہ سکیں۔ یعنی ان بڑوں کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ سارا معاشرہ ان ہی کے رنگ میں رنگا جائے۔ عوام کی اصلاح کے بجائے انہیں ان کی غلط روی میں اور پختہ کر دیا جائے۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ ان بڑوں میں اربابِ اقتدار کے علاوہ مذہبی راہنما بھی شامل تھے۔ اس کی تصریح دوسرے مقام پر ان الفاظ میں ملتی ہے:-

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (۳۳/۶۷)۔

یہ عوام کہیں گے کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! ہم نے اپنے ان مذہبی راہنماؤں اور اربابِ اقتدار کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے گمراہ کر دیا۔ (سائدین اور قائدین میں یہ سب اکابر شامل ہو جاتے ہیں)۔

اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی درخواست کریں گے:-

رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا (۳۳/۶۸)۔

تو انہیں دُہری سزا دے اور انہیں زندگی کی خوشگواریوں سے اس طرح محروم رکھ کہ ان تک کچھ بھی نہ پہنچنے پائے۔

دوہری سزا اس لئے کہ ایک تو یہ خود گمراہ ہوئے اور دوسرے انہوں نے ہمیں بھی گمراہ کیا۔

دوسرے مقام پر اس مکالمہ کے ضمن میں کہا ہے: یہ اربابِ سیادت و قیادت عوام سے کہیں گے کہ ہم تو تمہیں غلط راستے پر چلنے پر مجبور نہیں کیا کرتے تھے تو وہ جواب میں کہیں گے: قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ (۳۷/۲۸) تم چاروں طرف سے ہجوم کر کے ہمیں گھیر لیا کرتے تھے۔ تمہارے پاس بڑے بڑے مؤثر ذرائع اور اسباب تھے جن سے تم ہم پر چھا جایا کرتے تھے۔ اس کے بعد تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم ہمیں اپنے راستے پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کیا کرتے تھے؟ اس کے جواب میں وہ سرغنے کیا کہیں گے اسے ہم ذرا آگے چل کر بیان کریں گے۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ عوام کی یہ عذر خواہی بارگاہِ خداوندی میں بھی قابلِ قبول نہیں سمجھی جائے گی۔ عوام اور ان کے یہ سرغنے دونوں جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوں گے:-

عوام ان بڑوں سے کہیں گے کہ ہم تمہارا اعتبار کیا کرتے تھے۔ تم ہمیں بڑے بڑے سبز باغ دکھایا کرتے تھے تم کہا کرتے تھے کہ تم بڑی قوت کے مالک ہو۔ تو کیا تم اب ایسا نہیں کر سکتے کہ اس تباہی سے بچنے کی کوئی سبیل پیدا کر دو۔ وہ کہیں گے کہ اگر ہمیں اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر آتی تو ہم تمہارے بچاؤ کی بھی کوئی شکل نکالتے۔ اب تم چیخو چلاؤ یا اسے خاموشی سے برداشت کرو۔ اس سے نکلنے کی کوئی

راہ نہیں (۱۴/۲۱ ، ۴۰/۴۷)۔

اس سے متصل آیت میں ان سرغنوں کو "شیطان" کہہ کر پکارا گیا ہے اور اس کی طرف سے یہ جواب دہرایا گیا ہے کہ جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں اسے اچھی طرح سمجھو۔ ایک بات تم سے خدا نے کہی تھی تو وہ بات حقیقت بن کر تمہارے سامنے آگئی۔ اور ایک بات میں نے تم سے کہی تھی تو واقعہ اس کے خلاف ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس کوئی ایسی قوت نہیں تھی کہ میں تمہیں اپنے پیچھے زبردستی لگا لیتا۔ جو کچھ ہوا وہ اتنا ہی ہے کہ میں نے تمہیں آواز دی تو تم نے اس پر فوراً لبیک کہہ دیا اور اس طرح میرے بلاوے کو قبول کر لیا۔ لہٰذا، تم مجھے الزام مت دو۔ خود اپنے آپ کو الزام دو۔ اب میں بھی چیخ و پکار کرتا ہوں کہ میں گیا، اور تم بھی چیخ و پکار کر رہے ہو کہ تم تباہ ہو گئے۔ سارا معاشرہ کہرام مچا رہا ہے، چھوٹے بڑے سب دہائی دے رہے ہیں لیکن نہ میں ہی تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں نہ تم ہی مجھے بچا سکتے ہو۔ تم نے اس سے پہلے جو یہ روش اختیار کر رکھی تھی کہ میرے قوانین و احکام کی اطاعت، اطاعتِ قوانینِ خداوندی کی طرح کیا کرتے تھے۔ میں تمہاری اس روش سے بری الذمہ ہوں۔ تم نے اسے خود ہی اختیار کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بھی قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتیں ان کے لئے الم انگیز تباہی ہوتی ہے:

اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۱۴/۲۲)۔

یہاں تو کہا کہ ظالمین کے لئے الم انگیز تباہی ہوتی ہے لیکن دوسری جگہ اس کی وضاحت کر دی کہ غلط روش پر چلنے والے معاشرے پر جب تباہی آتی ہے تو وہ اس خاص گروہ تک محدود نہیں رہتی۔ سارا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آ جایا کرتا ہے۔ اس لئے کہا:۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (۸/۲۵)۔

اس تباہی سے بچنے کی کوئی صورت پیدا کر لو کہ جب وہ آیا کرتی ہے تو ظالمین تک ہی محدود نہیں رہا کرتی۔ پوری کی پوری قوم کو تباہ کر دیا ہے۔ یاد رکھو! غلط نظام کے عواقب بڑے شدید ہوتے ہیں۔

جب ذمے دارارباب حل وعقد کی بدعنوانیوں کے سبب نہر کا بند ٹوٹتا ہے تو یہ سیلاب چن چن کر انہی لوگوں کے گھروں کا رُخ نہیں کرتا جو اس بند کے ٹوٹنے کے ذمہ دار تھے۔ وہ سارے کے سارے گاؤں کو ڈبو دیا کرتا ہے۔ حتٰکہ وہ مسجد اور مندر میں بھی تمیز نہیں کرتا۔

جہنم میں عوام اور ارباب قیادت و سیادت کے مکالمات ہمارے سامنے آ گئے۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ عوام کی عذر خواہی کے دلائل کو بھی قابل قبول نہیں سمجھا گیا۔ لیکن اس کے باوجود اکثر لوگوں کے ذہن میں یہ خیال ابھرا کرتا ہے کہ غلط نظام کے ذمہ دار تو اکابرینِ قوم ہی ہوتے ہیں۔ عوام بیچارے مجبور ہوتے ہیں۔ اس لئے اکابرین کے ساتھ انہیں بھی جہنم کے عذاب میں کیوں مبتلا کیا جاتا ہے؟ سزا تو انہی کو ملنی چاہیئے جو اس غلط روی کے ذمے دار تھے۔ جذباتی طور پر یہ اعتراض کچھ وقیع سا نظر آتا ہے لیکن قرآن کریم جذبات سے نہیں حقائق سے

بحث کرتا ہے۔ اس نے اس قسم کے اعتراضات کا جواب ایسے انداز میں دیا ہے جو گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ اس سلسلے میں اکابرین نے ان سے کہا تھا کہ بات یہ نہیں کہ ہم پورش کر کے تمہیں ورغلا دیا کرتے تھے؛ بَلْ لَّمْ تَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۳۷/۲۹) تمہارا اپنا ایمان کمزور تھا: وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ۔ ہمارا تم پر کوئی غلبہ و اختیار نہیں تھا: بَلْ كُنتُمْ قَوْمًا طَاغِينَ (۳۷/۳۰) غلط راستہ پر چلنے کے لئے تمہارا اپنا ہی جی چاہتا تھا۔ (شیطان کے الفاظ میں) تمہاری بے راہ روی میں میرا اتنا ہی حصّہ ہے کہ میں نے جب دیکھا کہ تم غلط روش کے لئے پہلے ہی سے مچل رہے ہو تو میں نے تمہیں آواز دی کہ آؤ اکٹھے مل کر لوٹ مار مچائیں۔ تو تم نے اس پر فوراً لبیک کہہ دیا۔ اگر قوانینِ خداوندی پر تمہارا ایمان محکم ہوتا تو کسی کی کیا مجال تھی کہ تمہیں صحیح راستے سے بہکا دیتا؟ اسی لئے قرآن کریم نے کہا کہ فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ (۳۷/۳۳)۔ یہ سب اس سزا میں مشترک ہیں؛ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ (۳۷/۳۴) یہ سب یکساں مجرم ہیں اور مجرمین کے ساتھ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ایسا ہی برتاؤ کیا کرتا ہے۔

قرآن کریم نے ان تمام اعتراضات کا جواب ایک ہی فقرہ میں دے دیا کہ عوام کا قصور یہ تھا کہ انہیں خود قوانینِ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان نہیں تھا۔ صاحبِ ایمان کو دنیا کی کوئی طاقت غلط روش پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اکابرین کے پاس از خود کوئی قوت ہوتی ہی نہیں۔ یہ تو ان عوام ہی کی عطا کردہ ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

این خدا تا سجدہ اش کردی خداست   تا یکے اندر قیام آئی فناست

ان خداؤں کی خدائی تو اُس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک تم ان کے حضور سجدہ ریز رہو۔ تم کھڑے ہو جاؤ تو یہ فنا ہو جائیں گے۔ یہ تو برف کے بت ہیں جو اس وقت تک خدا بنے بیٹھے رہتے ہیں جب تک سورج نہیں نکلتا۔ طلوعِ آفتاب کے بعد تو یہ خود ہی پگھل کر پانی ہو جاتے ہیں۔ شیطان کا غلبہ اس وقت تک ہے جب تک لوگ اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ اگر یہ اُس کی اطاعت نہ کریں تو اسے دنیا میں کوئی پوچھے تک نہیں۔ لہٰذا، غلط رَو اکابرین کے جرائم کی ذمہ داری درحقیقت ان عوام پر عائد ہوتی ہے جو بھیڑ بکریوں کی طرح سر جھکائے ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ: بَلْ لَّمْ تَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۳۷/۲۹) ان کا ضعفِ ایمان بلکہ عدمِ ایمان۔ علامہ اقبالؒ نے اسی قسم کے ننگِ انسانیت محکوموں کو قوموں کی تباہی کا باعث قرار دیا ہے۔ وہ ایک قطعہ میں کہتے ہیں :-

شنیدم مرگ با یزداں چنیں گفت   چہ بے نم چشم آں کز گل بزاید
چہ جانِ او بگیرم شرمسارم   ولے اورا ز مردن عار ناید

اور اس کے بعد ہے :-

نیاتش دہ کہ میرِ شش جہات است   بدستِ او زمامِ کائنات است
نگردد شرمسار از خواریٔ مرگ   کہ نامحرم ز ناموسِ حیات است

(ارمغانِ حجاز ص ۱۷۶)

یہ وہ نزع کا عذاب ہے جس میں یہ ساری عمر سسکیاں لیتا رہتا ہے۔ اور اس کے بعد جب وہ مرتا ہے تو قبر اس سے کہتی ہے:

آہ ظالم تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا! — میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری نوتاک
تیری میت سے میری تاریکیاں تاریک تر — تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک
الحذر! محکوم کی میت سے سو بار الحذر — اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک! (ارمغانِ حجاز ص۲۳۷)

قرآن کریم کی ساری تعلیم غلامی و محکومی کے خلاف اعلانِ جنگ ہے ـــــ موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے ـــــ غلامی سے اس کی مراد ہے انسانوں کے احکام و قوانین کی اطاعت، خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو اور خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اور آزادی سے اس کی مراد ہے خدا اور صرف خدا کے قوانین و احکام کی اطاعت جو اس کی کتاب میں مرقوم و محفوظ ہیں۔ اس کے نزدیک انسانوں کی محکومیت شرک ہے اور خدا کی محکومیت توحید۔ قرآن کا یہی وہ بنیادی پیغام ہے جس کی تشریح علامہ اقبالؒ عمر بھر کرتے رہے یہی وہ غلامی ہے جس کے متعلق انہوں نے کہا کہ ؎

دین و دانش را غلام ازداں دھد — تا بدن را زندہ دارد، جاں دھد
گرچہ بر لب ہائے او نامِ خداست — قبلۂ او طاقتِ فرماں رواست (زبورِ عجم)

وہ محکوم اور آزاد کا تقابل ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید — آزاد کا دل، زندہ و پُرسوز و طربناک
آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم — محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت — ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش — وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک (ارمغانِ حجاز)

محکوم جب تک اس فریبِ نفس میں مبتلا رہتا ہے کہ ـــــ گو شے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے ـــــ پنجرے کی نرم و نازک تیلیاں فولادی سلاخیں بنی رہتی ہیں۔ لیکن جب اس کے دل میں آرزوئے آزادی بیدار ہوتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے پابندِ قفس نہیں رکھ سکتی۔ وہ ساحرینِ دریائے فرعون اور اس کی کابینہ کے ایک ممتاز رکن (مردِ مومن) کو مثال کے طور پر سامنے لاتا ہے (۲۰/۵۰ و ۴۰/۴۴) یہ بتانے کے لئے کہ

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو — تھرتھراتا ہے جہانِ چار سُو و رنگ و بو
پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انسان کا ضمیر — کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
حربۂ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش — حاکمیت کا بتِ سنگین دل و آئینہ رو (ایضاً)

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ قرآنِ مجید کیوں محکومی پر رضامند رہنے والوں کو جہنم کا ایندھن اور اس کے شعلوں کا برابر کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ ان شعلوں کا جن کی تپش دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے (۱۰۴/۶)

والسلام

مطالب الفرقان

جلد سوم

مفکرِ قرآن جناب **پرویز** نے اپنی زندگی قرآنِ کریم کی فکر اور تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پہلے لغات القرآن شائع کی۔ پھر اس کی روشنی میں پورے کے پورے قرآن مجید کا مفہوم، مفہوم القرآن کے نام سے شائع کیا۔ پھر تین ضخیم جلدوں میں قرآنی انسائیکلو پیڈیا (تبویب القرآن) مرتب کیا۔ اور اس کے بعد اس تمام تحقیق کی روشنی میں قرآن مجید کی مسلسل تفسیر کا سلسلہ مطالب الفرقان کے نام سے شروع کیا۔ اس کی پہلی جلد سنہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی اور مشتمل تھی سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی ابتدائی ۲۹ آیات پر۔ دوسری جلد جو سورۃ بقرہ کی آیات نمبر ۳۰ تا نمبر ۱۱۲ پر مشتمل تھی، سنہ ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب اس سلسلہ کی تیسری جلد شائع ہوئی ہے جس میں سورۃ بقرہ اختتام پذیر ہو گئی ہے۔ کتاب میں قرآنی تعلیم و حقائق کے کون کون سے موضوعات آ گئے ہیں اس کا اندازہ تو اس کے مطالعہ ہی سے لگ سکے گا۔ ذیل میں اس کے ابواب کے عنوانات دیئے جاتے ہیں:

(۱) الدّین کے بنیادی اصول (۲) معمارِ حرم (۳) مرکزِ ملت (کعبہ)۔ (۴) زمزمگاہِ حیات۔ (۵) بیّنات اور کتاب (۶) آل ورلڈ مسلم کانفرنس۔ (۷) درونِ خانہ (عائلی زندگی)۔ اور (۸) قرآنی نظام کے ابتدائی مراحل

آخر میں تینوں جلدوں کے مضامین کا ایک جامع انڈکس دیا گیا ہے۔ کہنے کو تو یہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کے مضامین کا انڈکس ہے لیکن اس میں اسلام کا پورا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔

کتاب دلائتی سفید کاغذ پر آفسٹ کی اعلیٰ درجہ چھپائی میں چھپی ہے۔ ضخامت (پہلی جلدوں کے مقابلہ میں زیادہ یعنی) صفحات ۵۴۸۔ جلد مضبوط بھی اور دلکش بھی۔ قیمت -/۷۵ روپے فی جلد۔ خرچ ڈاک -/۵ روپے

کتاب ملنے کا پتہ

① مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور ② ادارہ طلوعِ اسلام بی ۲۵ گلبرگ ۲۔ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی

"اُن کی تباہی پر نہ آسمان رویا، نہ زمین
کی آنکھ نم آلود ہوئی" ۴۴/۲۹ (اَلۡقُرۡاٰنِ الۡعَظِیۡم)

——— (پرویز)

دو ذہنیتوں کا فرق قابلِ غور ہے۔

ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں ایسا انتظام کر لوں کہ قانون کی گرفت میں نہ آسکوں، یا اگر اس کی گرفت میں آبھی جاؤں تو، اپنے اثر و رسوخ، سفارش، رشوت کے مواخذہ سے بچ جاؤں تو پھر مجھے کسی کی پرواہ نہیں، میں جس پر چاہوں، ظلم و زیادتی کر دوں، جن طریقوں سے چاہوں اپنے مفاد حاصل کروں۔ جس قانون کی جی چاہے، خلاف ورزی کر دوں، جس قسم کی چاہوں دھاندلی مچاؤں۔ میں اپنے ہر مقصد میں کامیاب رہوں گا اور مجھے کسی قسم کا خوف و خطر نہیں ہو گا۔ اسی طرح ایک قوم سوچتی ہے کہ اگر میں اپنے ہاں کافی قوت جمع کر لوں، تو پھر جس قوم کا جی چاہے گلا دبا دوں، جسے چاہوں اپنا غلام بنا لوں، جس پر چاہوں ظلم و استبداد کر دوں، ہر طرح کی کامیابیاں اور کامرانیاں میرے حصے میں آئیں گی۔ مجھے کسی سے کوئی ڈر اور خوف نہیں ہو گا۔

لیکن ایک دوسرا شخص (یا قوم) ہے جسے ہر طرح کی قوت حاصل ہے۔ اس کا اثر و رسوخ بھی کافی ہے، دولت اور ذرائع کی بھی کمی نہیں، اسے دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنے کے تمام مواقع حاصل ہیں۔ اسے جائز و ناجائز طریق سے مال و دولت حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ لوٹ کھسوٹ اور سلب و نہب کی کوئی باز پرس نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جو اس کا ہاتھ روک سکے یا گلا دبا سکے۔ اس کے گرد و پیش افراد (یا اقوام) دن دہاڑے ناانصافیاں کرتے اور (بظاہر) پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے سامنے زندگی کا ایک محکم نظریہ، ایک اٹل قانونِ حیات، ایک غیر متبدل کلیہ ہے جس کی صداقت پر اُسے یقینِ کامل ہے۔ یعنی یہ کہ

اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۲۱)

یاد رکھو! ظلم کرنے والا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ظالم کی کھیتی پروان نہیں چڑھ سکتی، وہ کبھی پنپ نہیں سکتا۔

اس نظریۂ زندگی، اس قانونِ حیات، اس محکم کلیہ پر اس کا ایمان، ظلم و جور کے ہر قسم کے ذرائع، اور مواقع کے باوجود، اسے کبھی ظلم و جور پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تم کس فریب میں مبتلا ہو، دیکھتے نہیں کہ لوٹ کھسوٹ کرنے والے کس طرح دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتے چلے جاتے ہیں، ایسے مواقع روز روز نہیں آتے۔ لیکن وہ اس ترغیب و تحریص کے باوجود، کامیابی کے لئے کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہیں کرتا۔ اور اپنے "ناصح مشفق" سے سر ہلا کر کہہ دیتا ہے کہ جسے تم ان کی ترقی سمجھ رہے ہو، یہ سب "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" ہے — حقیقت یہی ہے کہ:-

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا — (۶/۴۵)

ظلم کرنے والی قوم کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

زندگی کا یہ قانون اٹل ہے کہ هَلْ یُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ — (۶/۴۷) ظالم قوم کی تباہی یقینی ہے۔ وہ زندگی کی شادابیوں اور خوشگواریوں سے محروم رہ جاتی ہے۔ (لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ۔ ۷/۴۵)

اوّل الذکر ذہنیت کا نام ہے — خدا کا انکار — اسے کفر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی خدا کے ابدی قوانین کی صداقت سے انکار — اور ثانی الذکر ذہنیت کو خدا پر ایمان کہتے ہیں اور اس قسم کا ایمان رکھنے والوں کو قرآن کی زبان میں مومن اور مسلم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

آیئے! ہم دیکھیں کہ ہمارا شمار کس گروہ میں ہوتا ہے۔

ظلم کسے کہتے ہیں؟

اس مقصد کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ظُلم کسے کہتے ہیں؟ اس کے معانی کیا ہیں اور مفہوم کیا؟

لفظ ظُلم کے بنیادی معنی "کمی کرنے" کے ہیں۔ یعنی کسی کے حقوق و واجبات میں کمی کرنا۔ اسے وہ کچھ، اور اتنا نہ دینا جس کا وہ حقدار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہر قسم کی ناانصافی، جور، استبداد، قانون کی خلاف ورزی، اور سرکشی آجاتی ہے۔ لیکن امام راغبؒ نے اس (لفظ) کی ایک ایسی تعریف (DEFINITION) دی ہے جو اس کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ یعنی ظلم سے مراد ہے:-

کسی شے کا اس مقام پر نہ ہونا جس مقام پر اُسے ہونا چاہیئے۔

اسی سے لفظ "ظلمت" آتا ہے۔ جس کے معنی ہیں ـــــ جس مقام پر روشنی ہونی چاہیئے تھی وہاں روشنی کے بجائے تاریکی ہونا۔

یہ تو ہوئے اس کے لغوی معنی۔ لیکن قرآنِ کریم، اس کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو اس صراحت اور وضاحت سے سامنے لایا ہے کہ ان کی روشنی میں، اس جامع حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری ہی نہیں رہتی کہ ظلم کسے کہتے ہیں اور ظالم کون ہوتا ہے۔

شرک سب سے بڑا ظلم ہے

سب سے پہلے وہ، ظلم کے ایک ایسے گوشے کو سامنے لاتا ہے جس کی طرف کسی کی نگاہ ہی نہیں اُٹھ سکتی تھی۔ آپ نے کبھی کسی کو یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ شرک ظلم ہے۔ اور مشرک، ظالم ہوتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کا اعلان ہے کہ شرک، ظلم ہی نہیں بلکہ "ظلمِ عظیم" ہے (۳۱/۱۷) یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

قرآنِ کریم کی رُو سے توحید (یعنے ایک خدا کو ماننے) سے مراد یہ ہے کہ انسان، صرف قوانین و احکامِ خداوندی کی اطاعت کرے۔ اس کے سوا کسی اور کی اطاعت نہ کرے۔ اگر اس نے، خدا کے (سوا یا اس کے) علاوہ کسی اور کے احکام و قوانین کی اطاعت کی، تو اس نے گویا، اس شخص (یا قوت) کو اس اقتدار و اختیار میں شریک کر لیا جو صرف خدا کے لئے مختص تھا۔ اس سے یہ شخص (یا قوت) اس مقام پر نہ رہے جس مقام پر انہیں رہنا چاہیئے تھا۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا؟

دوسری طرف اس انسان کو لیجئے جو شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔ خدا نے انسان کو کائنات میں سب سے بلند مقام عطا فرمایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ۔ (۴۵/۱۳) "جو کچھ زمین و آسمان میں ہے، خدا نے اس سب کو تمہارے لئے تابع تسخیر کر دیا ہے"۔ یہ تو رہا خارجی کائنات کے متعلق۔ باقی رہے دوسرے انسان تو اس نے کہا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ اب اگر ایک انسان، خارجی کائنات کی کسی قوت کے سامنے جھکتا ہے تو وہ اپنے سے ادنیٰ شئے کو، اپنے سے زیادہ عظمت کا مستحق قرار دیتا ہے اور اگر کسی انسان کے احکام کے سامنے جھکتا ہے تو یہ اپنے جیسے انسان کو اپنا حاکم قرار دیتا ہے۔ اس کا یہ عمل، دونوں صورتوں میں، شرفِ انسانیت کی تذلیل کا موجب ہے۔ اس سے اس نے اپنے آپ کو اس مقام پر نہیں رکھا جس مقام پر انسان ہونے کی حیثیت سے اُسے ہونا چاہیئے، اور یہ بہت بڑا ظلم ہے۔

شرک کی پہلی صورت اگر خدا کے خلاف شرک تھا تو دوسری صورت، خود انسان کی اپنی ذات کے خلاف شرک ہے۔ اور یہ "ظلمِ عظیم" ہے۔

شرک (ظلمِ عظیم) کی اس شکل کو سامنے رکھیئے اور پھر دیکھیئے کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو اس جرم کے

مرتکب نہیں ہو رہے ——— زندہ انسان تو ایک طرف، ہماری ذلّت کی انتہا ہے کہ ہم مردہ انسانوں تک کے حضور جھکتے اور گڑگڑاتے ہیں اور ہر سانس میں غیر خداوندی احکام و قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ یاد رکھیئے! خدا کی عبادت کے معنی خدا کی اطاعت ہیں۔ یعنے اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا۔ لہٰذا، انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی محکومیت یا اطاعت اختیار کرنا ظلمِ عظیم ہے۔

(۰)

یہاں تک تو شرک (یعنی ظلمِ عظیم) کی اس نوع کا ذکر تھا جس میں انسان کسی دوسرے کی محکومیت اختیار کرتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم اس باب میں، ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر خدا کے احکام و قوانین کے خلاف، تم اپنے جذبات و خواہشات کے پیچھے چلنے لگ جاؤ تو یہ بھی شرک ہے۔ تمہارے جذبات کا صحیح مقام یہ ہے کہ ان سے، قوانینِ خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے، نہ یہ کہ انہیں اپنے آپ پر مسلّط کر لیا جائے۔ یہ بھی ظلم ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:-

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (۳۰/۲۹)

یہ ظالم، وحی کی روشنی کے بغیر، اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔

بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی کہ اتباعِ جذبات کو ظلم سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے لیکن بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ظلم و تعدی کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ انسان قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر، اپنی من مانی کرنے لگ جائے۔ اسی کو "اتباعِ جذبات بغیر علم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو شخص اپنے جذبات و خواہشات کو وحی کے تابع رکھے اور یوں تمام معاملات کے فیصلے، قوانینِ خداوندی کے مطابق کرے، اس سے ظلم سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔

ظالم حکومت

یہی سبب جب انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر، انسانوں کی اجتماعی زندگی سے متعلق ہو جائے، تو اس وقت یوں کہا جائے گا کہ عدل و انصاف پر مبنی حکومت وہی کہلا سکتی ہے جس میں تمام امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوں۔ جو نظامِ مملکت، قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم نہ ہو، قرآنِ کریم اسے ظالم کہہ کر پکارتا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے:-

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ (۵/۴۵)

جو حکومت، وحی خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتی، تو یہی لوگ ہیں جنہیں ظالم کہا جاتا ہے۔

ظالم بھی، اور کافر بھی۔ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ۔ (۵/۴۴)

منافقت

ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے کہ جب دیکھا جائے کہ خدا کے کسی حکم یا قانون کے مطابق فیصلہ لینے میں

فائدہ ہوتا ہے، تو اس کی اطاعت اختیار کر لی جائے۔ لیکن جو قانون اپنے خلاف جاتا ہو، اس سے اعراض برتا جائے۔ قرآنِ کریم اس منافقانہ طرزِ زندگی کو بھی ظلم سے تعبیر کرتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ :-

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور ان کی اطاعت بھی کرتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کا ایک گروہ اس اطاعت سے روگردانی اختیار کر لیتا ہے۔ یہ درحقیقت مومن ہے ہی نہیں۔

اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ جب انہیں اس نظام کی طرف بلایا جاتا ہے جسے خدا کے رسول نے احکامِ خداوندی نافذ کرنے کے لئے قائم کیا ہے تاکہ وہ ان کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرے، تو وہ گروہ اس سے اعراض برتتا ہے۔ لیکن اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا تو وہ اس کی اطاعت کے لئے لپک کر آتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ (۲۴/۴۷-۵۰)

یہ لوگ بھی ظالم ہیں۔

غلط نظریۂ زندگی

اصل یہ ہے کہ اس قسم کا منافقانہ انداز اختیار ہی وہ کرتا ہے جسے صحیح نظریۂ زندگی پر ایمان نہ ہو۔ نظریۂ زندگی ہی (جسے قرآن کلمہ کہہ کر پکارتا ہے اور دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں جسے آئیڈیالوجی کہا جاتا ہے) انسانی عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ہوتا ہے۔ غلط نظریۂ زندگی تو نہ خود ثبات ہوتا ہے، نہ ہی اس بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارتِ اعمال استوار ہو سکتی ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے غلط نظریۂ زندگی کے حاملین کو بھی ظالم کہہ کر پکارا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔

صحیح نظریۂ زندگی کی مثال ایک ایسے عمدہ پھل دار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں، محکم و استوار، ہوں اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں جھولے جھول رہی ہوں۔ وہ درخت، قانونِ خداوندی کے مطابق، ہر زمانے میں، ہر موسم میں، پھل دیئے جاتا ہے۔ اس طرح اللہ بسیط حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ جائیں۔

اس کے برعکس، غلط نظریۂ زندگی کی مثال ایک ایسے نکمّے درخت کی سی ہے۔ جس کی کھوکھلی سی جڑ، زمین کے اوپر ہی اوپر ہو، کہ اسے جب جی چاہے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔

اس طرح خدا، اس محکم نظریۂ زندگی کی رُو سے، ایمان والوں کی جماعت کو، ان کی دنیاوی زندگی میں بھی ثبات و تمکن عطا کر دیتا ہے۔ اور اُخروی زندگی میں بھی۔ اس کے برعکس غلط نظریۂ زندگی کے حامل (ظالمین) کی تمام کوششیں رائگاں جاتی ہیں اور یہ

سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ (۱۴/۲۶-۲۷)

دو نظریاتِ حیات

ایک نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں۔ اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ جسم کی پرورش اس لئے ضروری ہے کہ زندگی کی موجودہ سطح پر یہ اس کی ذات کا مرکب ہے اور اس کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ۔ زندگی کا حقیقی مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ اور یہ ان اقدار کی پابندی سے ممکن ہے جنہیں خدا نے اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ جس عمل کا جذبۂ محرکہ یہ ہو اسے ثبات و قرار ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ گویا انسان کی ذات کا جزو بن جاتا ہے۔ جو جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی۔ آگے بھی جاتی ہے۔

اس کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ زندگی بس اسی جسم کی زندگی ہے۔ اس کے خاتمہ سے خود انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریۂ زندگی کا حامل جو کچھ کرے گا، اس لئے کرے گا کہ اسے جسم کی پرورش و آسائش کا سامان ہاتھ آ جائے۔ اگر وہ کوئی ایسا کام بھی کرے گا جسے عام اصطلاح میں "نیکی" کہا جاتا ہے تو اس کا جذبۂ محرکہ اپنی نمود و نمائش ہو گا جس سے انسان کے انا کی تسکین ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے اعمال کے لئے بقا نہیں ہو سکتی۔ قرآنِ کریم نے اسے "اپنی ذات پر ظلم" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے:-

> ایسے لوگوں کے پیشِ نظر صرف طبیعی زندگی کی آسائشیں ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے جو کچھ صرف کیا جائے اس کی مثال ایسی ہے جیسے شدت کی سرد ہوا چلے اور ان لوگوں کی کھیتی تک جا پہنچے، جنہوں نے قانونِ خداوندی کے مطابق اس کی حفاظت کا سامان نہیں کر رکھا، تو یہ ہوا ان کی کھیتی کو تباہ کر دے گی۔ یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا۔ یاد رکھو! خدا کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا، لوگ خود اپنے آپ پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ (۳/۱۱۶)

غلط معاشی نظام

ظلم کا عام مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کے واجبات پورے پورے ادا نہ کئے جائیں۔ ان کے حقوق کی تلفی کی جائے۔ دوسروں کا مال ناجائز طریق پر کھا لیا جائے۔ محنت کش کو اس کی محنت کا ماحصل نہ دیا جائے۔ اس میں سے کچھ رکھ لیا جائے۔ دوسروں کی محنت کی کمائی پر تن آسانی اور عیش سامانی کی زندگی بسر کی جائے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ یہ سب خرابیاں غلط معاشی نظام کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس لئے غلط معاشی نظام، بجائے خویش بہت بڑا ظلم ہے اور اس قسم کے نظام کے حامل سب سے بڑے ظالم۔ قرآنِ کریم میں معاشیات کے متعلق اس قدر وضاحت اور کثرت سے آیا ہے کہ

ضمنی طور پر اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ (میں اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں) اس لئے اس مقام پر اس کے صرف دو ایک گوشوں کو سامنے لایا جائے گا۔ مثلاً سورۃ النحل میں ہے:۔

قوموں پر تباہیاں کیوں اور کب آتی ہیں، اسے ایک مثال سے سمجھو۔ ایک بستی تھی، جسے خارجی خطرات کی طرف سے امن اور داخلی کش مکش سے اطمینان حاصل تھا۔ اس کی طرف ہر سمت سے سامانِ رزق کھنچے چلا آتا تھا۔ اس کے رہنے والے بڑے خوشحال اور فارغ البال تھے لیکن انہوں نے خدا کی ان بخشائشوں کی ناقدر شناسی کی۔ (بڑے بڑے لوگوں نے انہیں اپنے لئے سمیٹنا اور چھپانا شروع کر دیا۔) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا ساختہ پرداختہ تھا۔

ان کی طرف خود انہی میں سے خدا کا ایک پیغامبر آیا۔ لیکن انہوں نے اسے جھٹلایا تو ان پر ہلاکت کا عذاب مسلط ہو گیا۔

اور یہ سب اس لئے ہوا کہ هُمْ ظَالِمُوْنَ۔ وہ ظالم تھے۔ (۱۶/۱۱۲-۱۱۳)

اِسی قسم کی مثال اس نے سورۂ کہف (آیات ۳۲-۴۳) میں بھی دی ہے اور تباہ ہونے والے کے متعلق کہا ہے کہ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ۔ اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کی شکل میں سامنے آیا۔

ننانوے دُنبیاں

غلط معاشی نظام کی ایک بنیادی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس میں بڑا سرمایہ، چھوٹے سرمایہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں غریب، غریب تر۔ اور امیر، امیر تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ظلم کی یہ وہ شق ہے جسے قرآن کریم نے، حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ کے سلسلہ میں یوں بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ ان کے پاس دو شخص اپنا معاملہ لے کر آئے۔

مستغیث نے کہا کہ فریقِ ثانی میرا بھائی ہے۔ اس کے پاس ننانوے دُنبیاں ہیں اس لئے بڑا خوش حال ہے اور میرے پاس صرف ایک دُنبی ہے۔ جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ مدد کرے۔ مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دُنبی بھی مجھے دے دے۔ چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحبِ اثر۔ اس لئے باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ اب آپ فیصلہ کیجئے کہ کیا اس کا یہ مطالبہ جائز ہے۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ۔ داؤدؑ نے کہا کہ اس شخص کا یہ مطالبہ سراسر ظلم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ جب بھی مِل جُل کر رہتے اور کاروبار میں باہمی شراکت کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں پر زیادتی کرتے رہتے ہیں۔ (۳۸/۲۳-۲۴)

لہٰذا، نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہی ظلم پر اٹھتی ہے۔

ربٰو

بڑا سرمایہ دار دوسروں کی محنت کی کمائی کو کس طرح غصب کر لیتا ہے، اسے قرآن کریم نے ربٰو سے تعبیر کیا ہے۔ ربٰو کے معنی صرف سود نہیں۔ اس سے مراد ہے سرمایہ کا معاوضہ لینا خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ قرآنِ کریم کی رُو سے، معاوضہ صرف محنت کا ہو سکتا ہے[1] سرمایہ کا نہیں۔ سود بھی اسی لئے حرام ہے کہ اس میں معاوضہ، سرمایہ کا لیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے، اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ جس نے کسی کو کچھ سرمایہ دیا ہے، اسے صرف سرمایہ واپس لینے کا حق ہے۔ اس سے زائد کچھ نہیں۔ بڑا جامع فقرہ ارشاد فرمایا ہے۔ جب کہا کہ اس طرح سے۔

لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (۲/۲۷۹)

نہ تم کسی پر ظلم کرو گے، نہ کوئی تم پر ظلم کرے گا۔

لہٰذا، محض سرمائے کے بدلے میں دوسروں کی محنت سے کچھ لے لینا ظلم ہے۔

مُترفین

جو لوگ خود محنت نہیں کرتے بلکہ (اپنے سرمایہ کے زور پر) دوسروں کی محنت کی کمائی غصب کر لیتے، اور اس طرح تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں، قرآنِ کریم انہیں مُترفین کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسی قوم کا کیا انجام بتایا ہے جس میں اس قسم کا معاشی نظام رائج ہو، یہ غور سے دیکھنے کی چیز ہے۔ سورۃ انبیاء میں ہے:۔

ہم نے تم سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جنہوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی (کَانَتْ ظَالِمَۃً) وہ تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔ ان کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے جا رہے تھے اور ان سے کہا جا رہا تھا کہ تم اس روش کو چھوڑ دو، ورنہ تباہ ہو جاؤ گے، لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے حتیٰ کہ وہ محسوس طور پر اُن کے سامنے آ گئے، تو وہ انہیں دیکھ کر لگے بھاگنے۔

لیکن اس وقت وہ بھاگ کہاں سکتے تھے۔ چنانچہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب تم بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو؟ مت بھاگو اور اُلٹے پاؤں اپنی انہی عیش

---

[1] "محنت کا معاوضہ" نہیں کہنا چاہیئے۔ اسی سے تمام غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کہنا یہ چاہیئے کہ محنت کرنے والا اپنی محنت کے ماحصل کا (سارے کے سارے ماحصل کا) حقدار ہوتا ہے۔

سامانیوں کی طرف چلو (مَا اُتْرِفْتُمْ فِيهِ) جنہیں تم نے دوسروں کی کمائی سے حاصل کر رکھا تھا، اور ان محلات کی طرف پلٹو جن میں تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ سمجھا کرتے تھے۔ وہاں چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے (لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُونَ) کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا۔

اُس وقت انہیں اس حقیقت کے اعتراف کے بغیر چارہ ہی نہ تھا کہ وہ واقعی ظالم تھے (اِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ) اپنے کئے پر سخت متاسف۔

لیکن اُس وقت اس ندامت اور تاسف سے کیا ہو سکتا تھا۔ جب نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں تو پھر وہ پلٹا نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ برابر چلاّتے رہے کہ جو زیادتیاں انہوں نے کی ہیں وہ ان پر بے حد متاسف ہیں۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ایسے کر دیا جیسے کٹا ہوا کھیت، یا بجھا ہوا شُعلہ۔ (۲۱/۱۱-۱۵)

ان آیات میں بنیادی نکتہ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُونَ ہے۔ یعنی یہ لوگ اپنے زعمِ باطل میں مبتلا تھے کہ ہم سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ لیکن خدا کے قانونِ مکافات نے برملا کہا کہ بتاؤ! تمہیں کوئی پوچھنے والا ہے یا نہیں؟

ان تباہ ہونے والوں کے متعلق دوسرے مقام پر کہا ہے کہ

ان کا یہ حال تھا کہ یہ ظالم اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے، تاکہ ان کی آسودگیوں اور تن آسانیوں میں فرق نہ آنے پائے، خواہ باقی انسانوں پر کچھ ہی کیوں نہ گذرے۔ یہ تھے ان کے وہ جرائم جن کی وجہ سے ان پر تباہی آئی تھی۔

یاد رکھو! خدا نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ کسی بستی کو یونہی اندھا دھند ظلم و زیادتی سے تباہ کر دے، درآں حالیکہ وہاں کے رہنے والے، اپنے اور دوسروں کے حالات کو سنوارنے والے ہوں۔ (تباہ وہی ہوتے ہیں جو ظالم ہوں) (۱۱/۱۱۶-۱۱۷)

باطل

اسی کو قرآنِ کریم نے "دوسروں کے مال کو باطل طریق سے کھا جانے" سے تعبیر کیا ہے۔ (۴/۲۹) اور کہا ہے کہ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذَالِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا۔ (۴/۳۰) یاد رکھو! جو معاشرہ ظلم و سرکشی سے ایسی روش اختیار کرے گا وہ بہت جلد تباہیوں کی آگ میں جھلس کر رہ جائے گا۔

احبار و رہبان

یوں تو قرآن میں ہر ناجائز طریقہ کو باطل کہا گیا ہے لیکن بنیادی طور پر اس سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں۔

جو کوئی تعمیری کام کرنے کے بغیر مفت میں بیٹھے دوسروں کی کمائی کھاتے رہیں۔ یعنی ایک تو وہ گروہ تھا جو اپنا سرمایہ لگا کر دوسروں کی محنت غصب کرتا تھا۔ لیکن ایک گروہ وہ بھی ہے جو سرمایہ تک بھی نہیں لگاتا، اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ گروہ ہے مذہبی علماء اور روحانی پیشواؤں کا جن کی تصریح قرآن کریم نے ان الفاظ میں کر دی کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ۔ (۹/۳۴)

اے جماعتِ مومنین! (ان مذہبی عالموں اور روحانی پیشواؤں سے ہوشیار رہو)، یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کا مال باطل طریق پر کھا جاتے ہیں۔ عوام بیچارے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف دعوت دینے والے لوگ ہیں۔ حالانکہ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کی راہ کی طرف آنے نہ پائیں، کیونکہ اس سے ان کی پیشوائیت ختم ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت آگے چل کر یوں کر دی کہ

ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے خود ساختہ مسلک کو شریعتِ خداوندی کا نام دے کر، لوگوں کو خدا کے سچے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے صاف اور سیدھے راستے میں خواہ مخواہ پیچ و خم پیدا کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات اور حیاتِ آخرت پر ان کا ایمان ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے مذہب کو محض بطور پیشہ اختیار کر رکھا ہوتا ہے۔ یہ وہ ظالم ہیں جن پر خدا کی لعنت برستی ہے۔ (۱۱/۱۹-۱۷)

اس طرح دین میں یہ لوگ اختلاف پیدا کر کے، امت کو فرقوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ یہ وہ ظلم ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ سورۂ زخرف میں (حضرت عیسےٰؑ کے تذکرہ کے ضمن میں) ہے:۔

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ أَلِيمٍ۔ (۴۳/۶۵)

ان میں مختلف گروہوں نے باہمی اختلاف پیدا کر لیا۔ سو جو لوگ اس طرح ظالم بن جائیں ان کے لئے الم انگیز تباہی کا عذاب ہوتا ہے۔

یعنی امت میں اختلاف پیدا کرنے والے ظالم ہیں اور اس کا نتیجہ عذاب۔

عام جرائم

یہ ظلم کی موٹی موٹی شقیں ہیں۔ ان کے علاوہ، قرآن کریم نے تمام قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کو ظلم کہہ کر پکارا ہے۔ حتیٰ کہ معاشرتی ز ان برائیوں کو بھی، جو غلط معاشرہ میں اس قدر عام ہو جاتی ہیں کہ انہیں برائیاں سمجھا ہی نہیں جاتا۔ مثلاً سورۂ حجرات میں ہے:۔

اے جماعتِ مومنین! یاد رکھو ایسا کبھی نہ ہو کہ تم میں سے ایک فریق، دوسرے فریق کا مذاق اڑانے لگ جائے اور اُسے ذلیل اور حقیر کرنے کی کوشش کرے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ تم سے بہتر ہی ہوں ——— نہ تمہارے مرد یہ کچھ کریں نہ عورتیں۔ نہ ہی تم ایک دوسرے کے خلاف عیب لگاؤ (بہتان تراشی کرو) نہ طعن و تشنیع کرو۔ نہ ایک دوسرے کے اُلٹے پلٹے نام رکھو۔ جب تم ایمان لاکر بلند اخلاق کے حامل بننے کا تہیّہ کر چکے ہو تو پھر آپس میں ایک دوسرے کے بُرے نام رکھنے کا کیا مطلب؟ یہ بُری بات ہے۔ اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا ہے تو اسے اپنے کئے پر نادم ہو کر فوراً اس روش کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کا شمار ظالمین میں ہو جائے گا۔ (۴۹/۱۱)

اس سے اگلی آیت میں یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کے متعلق ہمیشہ حسنِ ظن سے کام لو اور بدگمانی سے بچو۔ نہ ہی کسی کے راز کی باتوں کی ٹوہ میں لگے رہو، نہ ہی ایک دوسرے کی غیبت کرو۔ یہ سب برائیاں ایسی ہیں جو ظلم کی شق میں آجاتی ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی کا مذاق اڑائیں اور انہیں (SERIOUSLY) نہ لیں، انہیں بھی ظالم قرار دیا گیا ہے، اور ان سے کنارہ کش رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (۶/۶۸)

عدالتی نظام میں، مجرم کو اس کے جُرم سے زیادہ سزا دینا بھی ظلم ہے۔ (۶/۶۱)

(۰)

ظلم اور ہم

یہ ہیں ظلم کی نوعیتیں جو قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں بیان ہوئی ہیں۔ آپ انہیں سامنے رکھیئے اور پھر سوچیئے کہ ان میں سے کوئی شق بھی ایسی ہے جو ہمارے معاشرہ میں (نہ صرف یہ کہ پائی نہ جاتی ہو بلکہ) عام نہ ہو چکی ہو! اس حقیقت کو سامنے رکھیئے اور پھر قرآنِ کریم کے ان حتمی اور یقینی اعلانات کو سامنے لایئے، جنہیں اس نے اپنے غیر متبدل قوانین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یعنے یہ کہ

ظالم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ (۶/۲۱)

ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ (۲۸/۷)

ظالم قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ (۶/۴۷)

وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتی ہے۔ (۷/۴۴)

اس کی جڑ کٹ جاتی ہے اور انسانیت اس پر خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔ (۶/۴۵)

قرآنِ کریم نے یہ اصول اور قانون بیان کیا اور اس کی صداقت کی شہادت میں، وہ اقوامِ سابقہ کی سرگذشتوں کو سامنے لایا۔ اس نے قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم مدین، قوم لوط، قوم فرعون۔ غرضیکہ تمام اقوامِ سابقہ کی تاریخ پیش کی ہے اور واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ جب ان کے معاشرہ میں ظلم عام ہو گیا تو وہ تباہ ہو گئیں۔ وہ ان کے انفرادی تذکرہ کے بعد، بہ ہیئتِ مجموعی کہتا ہے کہ

یہ اقوامِ گذشتہ میں سے چند ایک کی سرگذشت ہے، جسے ہم، تم سے بیان کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض آبادیاں تو ابھی تک موجود ہیں اور باقی اُجڑ چکی ہیں۔

تم نے ان کے حالات سے دیکھ لیا ہوگا کہ ہم نے ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی۔ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر زیادتی کی تھی۔ سو جب ان کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آ گیا تو وہ جن غیر خداوندی قوتوں کے احکام کی اطاعت کیا کرتے تھے اور انہیں اپنا خدا سمجھے بیٹھے تھے، وہ ان کے کسی کام بھی نہ آسکیں۔ ان کی اطاعت اس سے زیادہ کچھ نہ کرسکی کہ وہ الٹا ان کی تباہی کا موجب بن جائے۔

لہٰذا، تاریخ کے ان نوشتوں سے تم اِس محکم اصول کو یاد رکھو، کہ جب بھی کسی قوم میں ظلم عام ہو جاتے تو وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت میں آجاتی ہے اور یہ گرفت بڑی سخت اور الم انگیز ہوتی ہے۔

اقوامِ گذشتہ کی ان داستانوں اور قانونِ مکافات کے اِس غیر متبدل اصول میں اُس قوم کے لئے واضح دلائل ہیں جو مستقبل کی تباہیوں کے احساس سے خائف رہتی ہے اور اس سے بچنا چاہتی ہے۔ ($\frac{11}{103-100}$)

اس میں دوسروں کے لئے سامانِ عبرت اس لئے ہے کہ یہ محض اقوامِ سابقہ کے کوائف اور اخبار (CHRONICLE) نہیں جنہیں اساطیر الاولین (پرانے زمانے کے لوگوں کی کہانیاں) سمجھ کر پڑھ لیا جائے۔ یہ تو خدا کے اس قانون کی زندہ شہادات ہیں کہ جس قوم نے بھی ظلم کی روش اختیار کی اس کا انجام یہ ہوا۔ اس لئے جو قوم بھی اِس قسم کی روش اختیار کرے گی اس کا انجام اسی قسم کا ہوگا۔

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ ($\frac{51}{59}$)

ہر زمانے کے ظالمین کا انجام وہی ہوگا جو ان سے پہلے زمانے کے ظالمین کا ہوا تھا۔

فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ($\frac{34}{19}$) وہ قومیں ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی صرف داستانیں باقی رہ جاتی ہیں۔ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ($\frac{34}{19}$) ان کی ہیئتِ اجتماعیہ ختم ہو جاتی ہے اور ان کے افراد اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے باقی رہ جاتے ہیں جو اپنی مٹی ہوئی عظمت کی عبرتناک یادگار ہوتے ہیں اور اپنے ماضی کی لاشوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے دربدر مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ اقوامِ سابقہ کی ان داستانوں کے بیان کرنے سے قرآن کا مقصد یہی ہے۔ وہ ہر داستان کے بعد ہم سے کہتا ہے کہ

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ($\frac{1}{39}$)

دیکھو! ظالمین کا انجام کیسا ہوا؟

وہ کہتا ہے کہ تم یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب نہ دے لینا کہ وہ قومیں کمزور تھیں۔ انہوں نے اپنے وسائل پیداوار کو ترقی دے کر، ان سے کماحقہ، فائدہ نہیں اٹھایا تھا، اس لئے وہ تباہ ہو گئیں۔ یہ خیال غلط ہے۔

وہ قومیں شان و شوکت میں (تمہاری ان مخاطب قوموں) سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں، انہوں نے زمین

کے سینے کو چیر کر اس میں چھپے ہوئے خزانوں کو باہر نکالا ـــــ ملکوں کو آباد کیا ـــــ اُن کی آبادیاں، اِن کی آبادیوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تباہ ہو گئیں۔ اس لئے نہیں کہ خدا نے انہیں یونہی ظلم و تعدی سے تباہ کر دیا۔ خدا کبھی ایسا نہیں کرتا۔ وہ تباہ اس لئے ہوئیں کہ (کَانُوْا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ) انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا۔ (۳۰/۹)

نہ ہی یہ تھا کہ وہ کوئی جاہل، وحشی، یا غیر مہذّب قومیں تھیں جو امورِ سیاست سے بے بہرہ اور علم و بصیرت سے بیگانہ تھیں۔ بالکل نہیں۔

وہ غیر مہذّب اور وحشی قومیں نہیں تھیں۔ انہیں علم و دانش کے تمام ذرائع ـــــ سماعت، بصارت اور قلب ـــــ حاصل تھے۔ لیکن چونکہ ان کی روش ظالمانہ تھی اس لئے ان کی عقل و بصیرت اور فہم و فراست ان کے کسی کام نہ آئی اور جس انجام کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور وہ تباہ ہو گئیں۔ (۴۶/۲۶)

اپنے آپ پر ظُلم

ہم نے اوپر (آیت ۳۰/۹ میں) دیکھا ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ ان تباہ ہونے والی قوموں پر خدا نے ظلم و زیادتی نہیں کی تھی۔ "انہوں نے خود اپنے آپ پر زیادتی کی تھی" (کَانُوْا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ) قرآنِ کریم نے یہ اصطلاح، ظلم کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر استعمال کی ہے اور یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن سادہ سے انداز میں پیش کرتا ہے۔ ظالم سمجھتا یہ ہے کہ وہ دوسرے کو نقصان پہنچا رہا ہے، لیکن اگر وہ ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھے تو اُسے نظر آجائے کہ وہ کسی دوسرے کو نقصان نہیں پہنچا رہا بلکہ خود اپنی ذات کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ وہ بزعمِ خویش دوسروں کو تباہ کرتا ہے لیکن درحقیقت اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہوتا ہے۔ مستبد حکمران اپنے مخالفین کو ہر طریق سے اذیت پہنچاتا اور تباہ کرتا ہے۔ اسی طرح بالادست قوم، کمزور قوموں کو کچلتی اور اس میں بڑی لذّت محسوس کرتی ہے۔ لیکن اس ظلم و تعدی سے وہ درحقیقت خود اپنی جڑیں کھوکھلی کر رہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ہر تباہ ہونے والی قوم کی داستانِ عبرت و موعظت بیان کرنے کے بعد، واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ

وَمَا ظَلَمْنٰھُمْ وَلٰکِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ (۱۱/۱۰۱)

ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم و زیادتی کی تھی، جس کی وجہ سے وہ تباہ ہو گئے۔

تباہی کہاں سے آتی ہے؟

یہ قومیں عقل و شعور کی مالک ہوتی ہیں۔ اس لئے اپنی طرف سے پورا پورا انتظام کر لیتی ہیں کہ ان پر کہیں سے تباہی نہ آنے پائے۔ وہ سیاسی تدبّر کی فسوں سازیوں سے، ایسے تمام راستے بند کر لیتی ہیں۔

جن سے وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی تباہی کے اسباب آسکتے ہیں۔ وہ ہر ممکن خطرہ کی روک تھام کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کرلیتی ہیں۔ وہ، ہر سر اٹھانے والے کا سر، قبل اس کے کہ وہ سر اٹھے، کچل کر رکھ دیتی ہیں۔ وہ اپنی طرف سے اپنی حفاظت کا سارا اہتمام کرلیتی ہیں۔ وہ اپنی سیاست کے محکم قلعوں میں (بزعمِ خویش) مصئون و مامون ہو کر بیٹھ جاتی ہیں، لیکن نہیں سمجھتیں کہ ان قلعوں کی بنیاد میں خرابی کی ایک صورت مضمر ہے جو اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کئے جا رہی ہے۔ چنانچہ، اُن کی ان تمام تدابیر کے علی الرغم، ان پر تباہی کا عذاب ان راستوں سے آجاتا ہے جو ان کی عقل و شعور تک میں نہیں ہوتے قرآن کے الفاظ میں:-

> جو کچھ یہ کر رہے ہیں، کوئی نئی بات نہیں۔ ان سے پہلی قوموں نے بھی اسی قسم کی ڈپلومیٹک تدابیر اختیار کر رکھی تھیں کہ کوئی ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے نہ پائے۔ لیکن خدا کے قانونِ مکافات نے ان کے نظامِ تمدّن کی بنیادوں تک کو ہلا دیا، اور اس کی چھتیں ان کے اوپر آکر گریں۔ انہوں نے اپنی طرف سے تباہی کے تمام راستے بند کر رکھے تھے۔ لیکن تباہی ان پر ان راستوں سے آپہنچی (مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ) جو ان کی عقل و شعور تک میں نہ تھے۔ (16/26)

تباہی کی شکلیں

یہ تباہی کن شکلوں میں آتی ہے۔ اس کے متعلق کہا کہ

> کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی نیچے کے طبقہ میں لاقانونیت پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے مخلوط پارٹیاں بنا لیتے ہیں، اور ایک دوسرے سے لڑ کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ (6/65)

ظلم کا اس قسم کا انجام فطرت کے ہاتھوں عمل میں آتا ہے جس میں تخریب ہی تخریب ہوتی ہے۔ لیکن یہی انقلاب جب ایک ایسی جماعت کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے جو اقدارِ خداوندی کے مطابق اپنا اجتماعی نظام قائم کرتی ہے تو اس میں ظالموں کی تباہی کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی تعمیرِ نَو ہوتی جاتی ہے جس میں عدل و انصاف کا دَور دَورہ ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم (سورۂ شعراء میں) "زندگی سے شاعری کرنے والی" جماعتوں کے مقابلہ میں، قومِ مومنین کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:-

> ان کے برعکس، وحی پر ایمان لانے والے ہیں جو ایک متعیّن نصب العین پر یقین رکھتے ہیں اور ایسے پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں جو ان کی اپنی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشوونما کرے اور دنیا کے بگڑے ہوئے کام بھی سنوارے۔ وہ زندگی کے ہر گوشے میں قوانینِ خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں۔ انہیں کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے دیتے جب

ان پر کوئی ظلم و زیادتی کرتا ہے تو وہ شاعروں کی طرح اس کی ہجو لکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا نہیں کر لیتے بلکہ اس سے اس ظلم و زیادتی کا بدلہ لیتے ہیں اور ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں ظلم و زیادتی کرنے والے بدلگام نہ پھرتے رہیں بلکہ انہیں نظر آجائے کہ ان کا صحیح مقام کونسا ہے جس کی طرف انہیں لوٹا کر لایا جائے گا۔ اس کو انقلاب کہا جاتا ہے۔ (۲۶/۲۲۷)

قوموں کی تباہی سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ ان کا کوئی فرد باقی نہیں رہتا۔ اس سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ان کی شان و شوکت، قوّت و ثروت، عزت و عظمت، حکومت و سطوت چھن جاتی ہے اور وہ دنیا میں ذلّت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہے۔

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ..... (۳۹/۲۶)

اُن کے ظلم کا نتیجہ یہ تھا کہ انہیں اسی دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنی پڑی۔ (اور مستقبل کا عذاب اس سے کہیں زیادہ ہوگا)

دوسرے مقام پر کہا ہے کہ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲) ــــ "ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا" یعنے وہ اپنی روٹی تک کے لئے دوسری قوموں کے محتاج ہو گئے اور انہیں اپنی ملّی ہستی کی حفاظت کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہا۔ یہ ہیں قوموں کی تباہی کی علامات۔ سورۂ طٰہٰ میں قرآن کریم نے اسے ایک ایسے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کے اجمال میں ہزار تفاصیل پوشیدہ ہیں۔ کہا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا۔ (۲۰/۱۱۱) ــــ اَلْخَيَّابُ اس چقماق کو کہتے ہیں جس سے آگ کی چنگاری نہ نکلے۔ یعنی ظلم کرنے والی قوموں کی کیفیت اس چقماق کی سی ہو جاتی ہے جس کی شکل و صورت تو ویسی کی ویسے ہی رہے لیکن اس میں زندگی بخش حرارت باقی نہ رہے۔ وہ شعلۂ افسردہ کی طرح ہو جائے۔ وہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جائے۔

مُہلت کا وقفہ

آپ نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہوگا کہ آپ کہتے ہیں کہ ظالم پنپ نہیں سکتا، لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ظالم دن رات پنپتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا ہر پروگرام کامیاب ہوتا ہے۔ وہ کھلے بندوں دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ افراد کا بھی یہی حال ہے اور اقوام کی بھی یہی کیفیت۔ جو قوم قوت فراہم کر لے، وہ دوسری قوموں کے خلاف جو جی میں آئے کرے، اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ مظلوم اور کمزور پستے چلے جاتے ہیں، اور ظالم اور قاہر بپھرے پھرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہاری نگاہ کی کمزوری ہے جو صرف چند قدموں تک دیکھ سکتی ہے، اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ اگر تمہاری حدِ نگاہ وسیع ہوتی تو تم دیکھ لیتے کہ ظالم، انجامِ کار، تباہ و برباد ہو کر رہتا ہے۔

بات یہ ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس شکل میں سامنے آنے میں ایک مدت ہوتی ہے، جسے مہلت کا وقفہ کہا جاتا ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ تو اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ محسوس شکل میں ایک مُدت کے بعد جا کر سامنے آتا ہے۔ تمہاری نگاہ اس "مُہلت کے وقفہ" میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے اور تم خیال کر لیتے ہو کہ ظلم نتیجہ خیز نہیں ہو رہا۔ بس یہ ہے تمہاری بھول۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔

تم اس کا وہم و گمان تک بھی نہ کرو کہ یہ ظالم اور سرکش لوگ جو کچھ کر رہے ہیں ہم اس سے بے خبر ہیں۔ ہمارا قانونِ مکافات سب کچھ دیکھ رہا ہے لیکن یہ وقفہ مہلت کا ہے۔ جب ظہورِ نتائج کا وقت آجائے گا، اس وقت تباہیوں کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ کر ان کی حالت یہ ہو جائے گی کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ افراتفری کا یہ عالم ہوگا کہ یہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر، منہ اٹھائے، بدحواس بھاگے چلے جائیں گے۔ سب ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ حتیٰ کہ ان کی نگاہ بھی کاشانۂ چشم میں لوٹ کر نہیں آئے گی۔ ان کے دل امیدوں سے خالی ہو جائیں گے۔ یاس انگیز تاریکیاں ان پر بُری طرح چھا جائیں گی۔ (۱۴/۴۲-۴۳)

دوسرے مقام پر اس قانونِ تدریج و امہال کی حکمت بھی بیان کر دی جہاں کہا کہ:-

اگر کائنات کے ارتقاء میں تدریجی قانون کارفرما نہ ہوتا، اور قانونِ مکافات لوگوں کے ظلم و زیادتی پر ان کی فوری گرفت کر لیا کرتا، تو صفحۂ ارض پر کوئی چلنے والا انسان نظر نہ آتا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا، بلکہ انہیں مقررہ تاریخی منازل تک پہنچانے کے لئے ان کے انجام کو مؤخر کرتا جاتا ہے اور جب وہ اپنے مستقر تک پہنچ جاتے ہیں تو اس کے بعد نہ ایک ثانیہ کی دیر ہوتی ہے، نہ سویر۔ ان کے اعمال کا آخری فیصلہ کن نتیجہ سامنے آجاتا ہے۔ (۱۶/۶۱)

اسی کو قرآن نے "پلڑا جھکنے" (ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ) سے تعبیر کیا ہے۔ قوموں کو سرفرازی اُس وقت نصیب ہوتی ہے جب ان کے تعمیری کاموں کا پلڑا جھکا ہوتا ہے۔ اس کے بعد، ان کی تخریبی کارستانیاں شروع ہو جاتی ہیں تو تعمیری پلڑا آہستہ آہستہ اوپر کو اُٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں اگر وہ اپنی اصلاح کر کے تعمیری کاموں کے وزن میں اضافہ کر لیں تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہیں۔ (مہلت کے وقفہ سے دراصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہلاکت سے پہلے، بازآفرینی کا موقع بہم پہنچایا جائے) لیکن اگر وہ اپنی روش سے باز نہیں آتیں، تو تخریبی پلڑا بھاری ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جب وہ تعمیری پلڑے کے مقابلہ میں، زیادہ جھک جاتا ہے، تو قوم پر تباہی آجاتی ہے۔ اس وقت بازیابی کا موقعہ باقی نہیں رہتا۔ تباہی کے اس طرح محسوس شکل میں سامنے آنے سے، انہیں خدا کے قانونِ مکافات کی صداقت کا یقین آجاتا ہے لیکن اس وقت یہ احساس و یقین انہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ دیکھئے!

سورۂ مومن میں اس حقیقت کو کس قدر والشگاف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

اگر یہ لوگ اس امر کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں کہ ظلم و تعدی سے قومیں کس طرح تباہ ہوا کرتی ہیں، تو ان سے کہو کہ ذرا دنیا میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو قومیں تم سے پہلے ہو گزری ہیں، ان کا انجام کیا ہوا۔ وہ تعداد میں بھی ان سے زیادہ تھے اور قوت میں بھی ان سے بڑھ چڑھ کر۔ انہوں نے زمین سے پیدا ہونے والے سامانِ زیست پر بھی ان سے کہیں زیادہ تصرف حاصل کر رکھا تھا لیکن ان کا مال و دولت اور ان کی ہنرمندی اور کاری گری، انہیں ان کے غلط اعمال کے تباہ کن نتائج سے بچا نہ سکے۔ وہ سب دھرے کا دھرا رہ گیا۔

جب ان کے رسول ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے انکی تکذیب کی، اور اپنے علم و ہنر پر نازاں رہے۔ (یعنی کہا کہ تم غلط کہتے ہو کہ ہماری موجودہ روش ہمیں تباہ کر دے گی۔ ہمیں کوئی تباہ نہیں کر سکتا۔ ہم نے سب ٹھیک ٹھاک کر رکھا ہے) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، اس نے انہیں آدبوچا۔

جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو چلا اٹھے اور کہنے لگے کہ ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور جن قوتوں کو ہم اس کے شریک سمجھتے تھے، ان سے انکار کرتے ہیں۔

لیکن اس ایمان نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا جسے وہ عذاب کو دیکھ کر لائے تھے۔ ایمان وہی نفع بخش ثابت ہو سکتا ہے جو ظہورِ نتائج سے پہلے لایا جائے کیونکہ اس صورت میں ہنوز وقت ہوتا ہے کہ انسان، تعمیری کاموں سے، سابقہ تخریبی اعمال کے مضر اثرات کا ازالہ کر سکے۔ (۸۵ - ۸۲ / ۹۰)

اور اس کے بعد ہے:-

سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ (۴۰ / ۸۵)

یہ خدا کا وہ قانون ہے جو انسانوں پر شروع سے نافذ ہوتا چلا آ رہا ہے۔

فرمایا:-

اُس وقت نہ تو ان کا ایمان کچھ کام دے سکے گا اور نہ ہی ان کا چیخنا چلّانا کچھ کفایت کر سکے گا۔ یہ مدد کے لئے چیخیں چلّائیں گے، اور کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ایک بار یہاں سے نکال دے، پھر دیکھ کہ ہم کس طرح اپنی سابقہ روش کے خلاف، تیرے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اچھے کام کرتے ہیں۔

ان سے کہا جائے گا کہ کیا تمہیں اتنی عمر نہیں دی گئی تھی کہ تم میں سے جو ہمارے قانون کے مطابق نصیحت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اس کے لئے کافی ہو جاتی ہے؟ اور پھر تمہارے پاس وہ پیغامبر بھی آ گیا تھا جو تم سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ تمہاری روش تمہیں تباہی کے

جہنّم کی طرف لے جائے گی۔ لیکن تم نے اس کی ایک نہ مانی۔ سو اب تم اپنے اعمال کے نتائج بھگتو۔ اب کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ظلم کرنے والوں کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔ (۳۵/۳۷)

کارگہِ کائنات کیوں سرگرمِ عمل ہے؟

ہمارے سامنے لوگوں کے غلط اعمال کی سزا کے لئے دنیا کا عدالتی نظام ہی ہوتا ہے جو ناقص بھی ہو سکتا ہے اور خائن (بددیانت) بھی۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ظلم کرنے والے دندناتے پھرتے اور دن بدن پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں، اور انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہیں، تو یہ دنیاوی نظامِ عدل کا نقص ہے۔ لیکن خدا نے جب کہا کہ "ظالم بچ نہیں سکتا" تو وہ اس کے لئے ہمارے نظامِ عدل کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کا اپنا نظام ہے جو نہ ناقص ہے نہ خائن۔ اس کی نتیجہ خیزی اٹل ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے:-

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ۔ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (۴۵/۲۲)

سلسلۂ کائنات اس لئے بالحق پیدا کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا رہے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ (نیز ۴۶/۱۹ ؛ ۴/۱۲۴ ؛ ۱۹/۶۰)

"کسی پر کسی قسم کا ظلم و زیادتی نہ ہو" ——— یہ ہے مقصدِ تخلیقِ کائنات ——— اسی کا نام خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے، جسے عوام کی زبان میں "خدا کی چکّی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ چکّی پیستی تو بے شک بہت باریک ہے لیکن اس کی رفتار (ہمارے حساب و شمار کے مطابق) بہت سُست ہوتی ہے۔ اور مظلوم کی یہ انتہائی آرزو ہوتی ہے کہ وہ ظالم کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ یہ تجھ سے کہتے ہیں کہ وہ تباہی جلد آنی چاہیئے۔ وہ تباہی ضرور آئے گی۔ خدا کا قانون اٹل ہے لیکن اس کی رفتار (ان کے معیارِ کی رُو سے) سُست ہے۔ خدا کا ایک دن، تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ (۲۲/۴۷)

اب اس کا کیا کیا جائے؟ مظلوم کے دل کی پکار رہ رہ کر کہتی ہے کہ:-

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

یہ ہے "بیتابی، تمنّا اور صبر طلبیٔ عشق" کی وہ کش مکش، جس کے حل کے لئے قرآن چاہتا ہے کہ دنیا میں خود انسانوں کے ہاتھوں ایک ایسا نظام قائم ہو جو لوگوں کے اعمال کی نتیجہ براری میں تو، نظامِ کائنات

ط عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب ؛ دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک (غالبؔ)

کے مائل ہو، لیکن اس کی رفتار سست نہ ہو۔ اس کا نام دین کا نظام، یا اسلامی مملکت ہے جس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ ـــــ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ـــــ ہر متنفس کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے، اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو، اس نظام کو سب سے پہلے، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے متشکل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ خدا کا وہی دن، جو نظامِ کائنات میں ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے، اس نظام میں کس طرح چوبیس گھنٹے کا بن جاتا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو دنیا کے کسی جابر اور ظالم سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس نظام کے داعی؏ کو آگاہ کر دیا گیا کہ یاد رکھو۔

یہ لوگ چاہیں گے کہ اگر تم تھوڑا سا اُن کی طرف جھک جاؤ تو یہ تمہاری طرف جھک جائیں دیکھنا، ایسا نہ کرنا۔ (۶۸/۹)

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (۱۱/۱۱۳) اگر تم ان ظالمین کی طرف ذرا سا بھی جھک گئے اور اس طرح ان سے مفاہمت کر لی، تو یاد رکھو تم بھی اسی جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں ـــــ تمہارا نظام عدل پر مبنی ہے اور عدل اگر ذرا سا بھی ظلم کی طرف مائل ہو جائے تو وہ عدل نہیں رہتا، ظلم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے مفاہمت کی کوشش کی تو اس نظام کے داعیٔ برحق؏ نے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ میں قوانینِ خداوندی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ میں تو خود انہی کا اتباع کرتا ہوں۔

اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّیْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۔ (۱۰/۱۶)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو مجھے اس کے نتیجے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں بھی اسی عذاب کی لپیٹ میں آ جاؤں گا۔

یہ تھا وہ نظام، جس کے متعلق اعلان کر دیا کہ یاد رکھو۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۔ (۲/۴۸)

اس میں کوئی شخص کسی کے جرم کا ذرا سا بھی بوجھ نہیں بٹا سکے گا۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا خود بھگتنی پڑے گی۔ نہ ہی کسی کی شفاعت کسی کے کام آ سکے گی، نہ ہی کسی سے اس کے جرم کے معاوضہ میں کچھ رشوت لے کر اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی شخص کسی مجرم کا حمایتی بن سکے گا۔

دنیا کے نظامِ عدل کی رُو سے، اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ مروّجہ قانون کے مطابق ہو جائے، تو عدل کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے لیکن قرآنِ کریم اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلہ عدل کہلائے گا لیکن اگر وہ خود قانون ہی ظلم اور ناانصافی پر مبنی ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کس طرح مبنی بر عدل قرار پا سکتا ہے؟ لہٰذا، وہ اس نظام کے متعلق جس کا ذکر اوپر کیا گیا

ہے کہتا ہے کہ اس میں قانون سازی کا اختیار انسانوں کو حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اصولی طور پر قوانین، خدا کے نازل کردہ ہوتے ہیں اور وہ نظام ان کے مطابق فیصلے کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

یَہْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِہٖ یَعْدِلُوْنَ۔ (۷/۱۵۹)

یہ لوگ دوسروں کو حق کی راہ بتاتے ہیں اور اسی کے مطابق عدل کرتے ہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے، جسے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے وہ لوگ ظالم ہیں جو "مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ" کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ (۵/۴۵)

(۰)

بازنجویشتن نگر

ظلم کی مختلف نوعیتیں، جنہیں قرآنِ کریم نے اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے، ہمارے سامنے آگئیں۔ آپ انہیں دیکھئے اور سوچئے کہ ان میں کوئی شق بھی ایسی ہے جو آج ہمارے معاشرے میں نہ پائی جاتی ہو؟ آپ دیکھیں گے کہ ظلم کی ان شقوں کا ہمارے ہاں پایا جانا تو ایک طرف، یہ ہمارے معاشرہ کا معمول بن چکی ہیں اور اس قدر عام ہو چکی کہ ان سے اب ہمارے دل میں کھٹک تک پیدا نہیں ہوتی ـــــ اگر کھٹک پیدا ہوتی ہے تو صرف اس وقت جب کوئی دوسرا ہم پر زیادتی کرے۔

اس کے بعد، آپ پھر وہیں چلے چلئے جہاں سے بات شروع کی گئی تھی۔ یعنی ایک ذہنیت یہ ہے کہ یہ کہنا کہ ظالم پنپ نہیں سکتا ـــــ ظلم کا انجام تباہی ہوتا ہے، کمزوروں اور ناتوانوں کی خود فریبی ہے۔ جو فرد یا قوم، قوت حاصل کر کے اپنی مدافعت کا سامان مہیا کر لیتی ہے، اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دنیا کا یہی چلن رہا ہے، یہی چلن رہے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرہ میں سارا زور اپنی قوت اور مدافعت کا سامان مہیا کرنے پر دیا جائے گا۔ ظلم وجود سے رُکنے کا خیال کبھی پیدا نہیں ہوگا۔

دوسری ذہنیت یہ ہے کہ خدا کا یہ اٹل قانون ہے کہ ظالم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور جس معاشرہ میں ظلم کا چلن عام ہو، وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے خواہ اس نے اپنی حفاظت اور مدافعت کے کتنے ہی انتظامات کیوں نہ رکھے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرہ میں، ساری کوشش ظلم سے رُکنے اور اسے روکنے کی کی جائے گی۔

اوّل الذکر ذہنیت کا نام خدا کا انکار (کفر) ہے۔ اور دوسری کو خدا پر ایمان (اسلام) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ ہمارا شمار کس زمرے میں ہو سکتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اسے بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے، کہ قانونِ خداوندی کے اٹل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اگر آپ اس پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ اپنا نتیجہ پیدا کرے گا۔ اور اگر آپ اسے صحیح تسلیم نہیں کرتے تو وہ معطل ہو جائے گا۔ قطعاً نہیں۔ وہ قانون بہرحال اور بہرحیثیت اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہے گا خواہ آپ اسے صحیح مانیں یا

نہ مانیں۔ سنکھیا بہرحال مہلک ہے، خواہ آپ اس کی ہلاکت آفرینی کو صحیح تسلیم کریں یا جھوٹ سمجھیں ——— اور سنکھیا اس شخص کو بھی اسی طرح ہلاک کرے گا جو زبان سے اس کی ہلاکت آفرینی کا اقرار کرے لیکن پھر بھی اُسے پھانک لے، جس طرح اس شخص کو ہلاک کر دے گا جو اُس کی ہلاکت آفرینی کا کھلے بندوں انکار کرتا ہوا اُسے چاٹ لے۔ لہٰذا، اگر خدا کا یہ قانون اٹل ہے۔ اور اس کے اٹل ہونے میں شُبہ ہی کیا ہے ——— (کہ جس قوم میں ظلم عام ہو جائے وہ تباہ ہو جاتی ہے) اور ہماری روش یہی رہی، تو "پاکستان زندہ باد" کے ہزار نعروں، اور "ملّت اسلامیہ، پائندہ باد" کی لاکھ تمناؤں کے باوجود، ہم تباہی سے بچ نہیں سکتے اس میں شبہ نہیں کہ بیرونی خطرات سے ملک کی حفاظت کا انتظام نہایت ضروری ہے، اور ایسا انتظام ضرور کرنا چاہیئے اور ملک کے ہر باشندے کو اس میں پورا پورا حصّہ لینا چاہیئے (کہ اپنی سرحدوں کو مضبوط و مستحکم رکھنے کا حکم بھی خداوندی ہے) اس میں بھی کلام نہیں کہ ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کے لئے مادی ترقی بھی نہایت ضروری ہے (کہ بھوک کو خداوند کریم نے عذاب قرار دیا ہے) لیکن، ان تمام انتظامات و اہتمامات کے باوجود، ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ہم نے اپنے معاشرہ میں ظلم کی بڑھتی ہوئی رَو کو نہ روکا، تو یہ انتظامات و اہتمامات ہمیں تباہی سے کبھی نہیں بچا سکیں گے، نہ ہی ہماری بے روح نمازیں اور ہمارے روزے، ہمارا حج اور ہماری زکوٰۃ، ہماری نذریں، اور ہماری نیازیں، ہمارے وعظ اور ہمارے خطبے، ہمیں اس تباہی سے محفوظ رکھ سکیں گے، کہ خدا نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ظالم قوم کی رسمی مذہب پرستی اسے ظلم کی آوردہ تباہی سے بچا لے گی۔

ظلم کے انجام کے سلسلے میں ہم عام طور پر ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کا ازالہ ضروری ہے۔ ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان (یعنی فریب) دے لیتے ہیں کہ ہم تو کسی پر ظلم نہیں کرتے اس لئے ہم پر کوئی گرفت نہیں ہو سکتی۔ خدا کے عذاب میں وہی لوگ ماخوذ ہوں گے جو ظلم کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ جب کسی معاشرہ میں ظلم عام ہو جائے اور اس کی وجہ سے قوم پر تباہی آجائے تو اس سے ساری کی ساری قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ جب سیلاب آتا ہے تو وہ نہ شریف اور بدمعاش کے گھر میں تمیز کرتا ہے، نہ مسجد اور مندر میں تفریق۔ وہ سب کو یکساں اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور صفایا کرتا چلا جاتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ:۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (۸/۲۵)

اس تباہی سے اپنے آپ کو (قبل از وقت) بچاؤ کہ جب وہ آتی ہے تو پھر انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جنہوں نے ظلم کیا تھا۔

جب کسی ناعاقبت اندیش کے کشتی میں چھید کر دینے سے کشتی میں پانی بھر جاتا ہے، تو اس سے صرف وہی شخص نہیں ڈوبا کرتا جس نے کشتی میں چھید کیا تھا ——— کشتی کے تمام مسافر ڈوب جایا کرتے ہیں۔

اس لئے ظلم کی رو کو روکنے کا اہتمام کرنا معاشرہ کے ہر فرد کی ذمہ داری، اور خود اس کی اپنی حفاظت کا تقاضا ہے۔

(۰)

بہرحال، وہ ہے خدا کا قانون، اور یہ ہے ہمارے معاشرے کی حالت۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ابھی اس مہلت کے وقفہ سے گذر رہے ہیں جو تباہی سے پہلے آتا ہے۔ اگر ہم اب بھی سنبھل جائیں تو ہمارے بچاؤ کی صورت ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم نے اس وقفہ سے فائدہ نہ اٹھایا اور اسی رفتار سے آگے بڑھتے گئے، تو پھر خدا کا اٹل قانون اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہے گا اور ہمارا حشر بھی انہیں قوموں جیسا ہو جائے گا جن کے متعلق کہا ہے کہ:-

وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ——— وہ قوم تباہ ہو گئی اور ہم نے کسی دوسری قوم کو اس کا وارث بنا دیا۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ ——— پھر اُن کی تباہی پر نہ آسمان نے آنسو بہائے نہ زمین کی آنکھ نم آلود ہوئی۔

وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ۔ (۴۴/۲۹-۲۸) ——— اور نہ ہی انہیں اس کی مہلت دی گئی کہ اپنے بچاؤ کا سامان کر سکیں۔

اور اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہاں قرآنی معاشرہ قائم کیا جائے۔

(طلوعِ اسلام۔ نومبر ۱۹۶۶ء)

(۰)

دِین

اپنی مکمّل، عملی شکل میں عہدِ فاروقیؓ میں قائم ہوا۔
اس کے کچھ عرصہ بعد یہ مذہب میں بدل گیا۔
دِین کی وہ شکل کیا تھی اور یہ مذہب میں کیسے تبدیل ہو گیا؟ اس کی تفصیل پرویز صاحب کی مایۂ ناز کتاب

شاہکارِ رسالتؐ

میں ملے گی۔
قیمت مجلد -/۴۵ روپے ——— (علاوہ محصولڈاک) ملنے کا پتہ
(۱) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور (۲) ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

محترم پرویز صاحب کا
درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لندن (انگلینڈ)
ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
149 SUTTON COURT RD
LONDON E-13 — 9NR.
PHONE 01 — 552-1517

لاہور میں ہر جمعہ ۸½ بجے صبح (فون 880800)
۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۳½ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
حیات سرجری کلینک ۲۳ ج ۔ پیپلز کالونی I
(فون نمبر ۲۷۴۵۵)

کراچی ہر جمعہ کو ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ
بزمِ طلوعِ اسلام ۔ کمرہ ۲۴ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ ۔ نیو چالی کراچی ۲ ۔ فون نمبر ۲۳۸۸۲۸

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ
چوہدری مقبول شوکت ۔ گل روڈ سول لائنز
(بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) برمکان ۔ آغا
محمد یونس صاحب ۔ رفیقی لین صدر ۔ بالمقابل دی آئی پی
(فون ۷۴۶۵۹) مین گیٹ ۔ پشاور سٹیڈیم ۔ ہاڑہ روڈ

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام
بمقام ۱۲/۱/بی بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
برمکان ڈاکٹر رضا محمد خاں ۔ نواب علی روڈ

جلال پور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی
میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۶۶ ۔ لیاقت روڈ

ملتان میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
(فون ۳۱۰۷۱) دفتر شاہ سنز ہیرون پاک گیٹ ۔

لیہ (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب
رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب سرکلر روڈ ۔ لیہ

پنج کسی میں ہر جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بوقت ۳ بجے شام
(تحصیل کبیر والا ضلع ملتان)
بمقام مطب حکیم امداد الدین صاحب
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام

قرآنی قوانین

للہ الحمد کہ پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف —— قرآنی قوانین —— ملک میں بے حد مقبول ہو رہی ہے اور اس کی افادیت نکھر کر سامنے آ رہی ہے ۔ اس سے نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا ۔ اگر آپ نے اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلدی منگوا لیجئے ۔

قیمت فی جلد (مجلد) ہیں روپے (علاوہ محصول ڈاک) ملنے کا پتہ ✱